اکیسویں صدی اور

مسلمان عورت

عامرہ احسان

ادارہ عفت

اکیسویں صدی اور مسلمان عورت

عامرہ احسان

ادارۂ عفت

کتاب	:	اکیسویں صدی اور مسلمان عورت
تعداد	:	آٹھ ہزار
اشاعت اول	:	2007ء
اشاعت دوم	:	2010ء
کمپوزنگ	:	محمد فاروق ضمیر
ٹائٹل	:	عاصم فاروق
پبلشرز	:	ادارۂ عفت، 267 نزد سٹیٹ لائف بلڈنگ، صدر روڈ، راولپنڈی

انتساب

اکیسویں صدی کی تین خواتین کے نام

مروہ شربینی ۔شہیدۂ حجاب

ڈاکٹر عافیہ صدیقی ۔وھن زدہ امت کی بہادر مظلوم بیٹی

مریم (ایوان ریڈلے) ۔اسلامی انقلاب کے ابھرتے سورج کی ایک کرن

ترتیب

ابتدائیہ

جس دن سے شعوری اسلام کی قبولیت کا مرحلہ طے ہوا۔ حقوقِ نسواں، اسلام میں عورت کا مقام، کے موضوعات پر کتب، رسائل، سیمینار، ورکشاپس سے واسطہ پڑتا رہا۔ ابتداً تو مدافعانہ اور معذرت خواہانہ صفائیاں پیش کرنے کا رویہ حیرت میں ڈال دیتا۔ لڑتی جھگڑتی مساواتی عورت کی پریشانی کی جڑ بنیاد سمجھنے سے قاصر تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ جب راقمہ نے اللہ کو رب جان کر ناطہ جوڑا تو باہمی اعتماد اور یقین پر یہ رشتہ استوار ہوا، جس میں حقوق کا باب تھا ہی نہیں۔ دنیا کا امتحان گاہ ہونا، فرائض کو حتی الوسع نبھانا اور جواب دہی کی فکر رکھنا سمجھ میں آتا گیا تھا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی رہنمائی واضح تھی۔ اسلام کی سکینت بخش زندگی، پردے کا تحفظ، مقصدِ زندگی، اس کے آغاز و انجام کی تمام تر تفصیلات سے آگاہی واضح تھی۔

شعور کے ابتدائی مراحل میں پہلی مرتبہ یہ سوال رفیق زندگی کے ایک امریکن پروفیسر نے کیا تو میں ٹھٹکی..... کہ ''آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس بات کو کیونکر ہضم کر پاتی ہیں کہ اسلام میں عورت دوسرے درجے کی مخلوق ہے۔'' میں نے بے ساختہ یہ جواب دیا، کہ آپ اسلام سے ناآشنا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اوّل تو مرد، عورت کے مابین جنس کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں رکھی کہ وہ جانب دار (partisan) نہیں ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ میری نگاہ میں اللہ نے حقوق کے تحفظ میں عورت کو فوقیت دی ہے اور

اس کی ناز برداری زیادہ کی ہے۔ دنیائے کفر میں گزرے ہوئے چند سالوں میں ہر لمحہ اس حقیقت پر ایمان پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ قریب سے اس تہذیب کو دیکھا جس کا جادو دنیا بھر میں سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ہم نے امریکہ کا تہذیبی کھوکھلا پن، یتیمی و بیسری بچشم سر دیکھی۔ اسکول میں اساتذہ اور ان کے تجربات اولڈ ہومز کے بوڑھے، نوجوان نسل کی بے ہدف زندگی، عورت کی کسمپرسی، بے یاری و مددگاری، چہار سو نفسا نفسی خود غرضی کا چلن، سطحی نمائشی اخلاق..... چودہ طبق روشن کر دینے کو کافی تھے۔ اس پس منظر میں اسلام میں عورت کو عطا کردہ وقار اور تحفظ، خاندانی نظام، اقدار و روایات کا حسن، اسلامی نظامِ زندگی کی پاکیزگی، مقدس تر ہوگئی لگتی تھی۔

بے پردگی اور بے شعوری کے ابتدائی سال، اپنے دور کی ایک بہترین یونی ورسٹی کی ڈگری، مغربی تہذیب کا چشم دید احوال قومی اسمبلی میں عملی سیاست کا تجربہ، چہار جانب پروفیشنل زندگی میں جھنڈے گاڑتی خواتین کا مشاہدہ۔ زندگی کے ان ہمہ پہلو تجربات اور ایک طویل دعوتی دور سے گزر کر آج جو اعتماد اسلام میں عورت کے مقام کے حوالے سے میرے دامن میں ہے وہ نہایت قیمتی متاع ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر مجھے دس مرتبہ زندگی دے اور ہر مرتبہ پوچھے کہ مرد بننا چاہو گی یا عورت..... تو بخدا میرا انتخاب ہر مرتبہ عورت بننا ہی ہوگا۔ یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دیے سائے ہم نے

وگرنہ اسلام کے دامانِ عافیت میں آج مغرب کی مجبور ''بے کس'' تشنہ لب استحصال شدہ عورت کے لیے اُس کے تمام تر غموں اور دُکھوں کا مداوا موجود ہے۔ مغربی تہذیب بدنصیبی سے آج گلوبل تہذیب بن چکی ہے۔ اس نظام میں سب سے زیادہ نقصان عورت کو پہنچ رہا ہے، جس کا تریاق ہم اہل اسلام کے پاس ہے لیکن ہم اس

سے خود بھی نابلد ہیں۔ ہمارے اپنے ہاں عورت جدید جاہلیت اور قدیم (ہندوانہ) جاہلیت کے مابین چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ دین آشنا طبقہ پورے اعتماد و یقین اور قوت کے ساتھ اس پیغام کو عام کرے۔ آنے والی نسلوں کو اسلام کا شعور اور خود اعتمادی دے۔ ہندوانہ تہذیب کی جہالت کا پوری قوت سے رد کیا جائے اور جدید جہالت کا ملمع اتار پھینکا جائے۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار اور روایات کو پورے فخر سے اپنایئے۔ معذرت خواہی سے دامن چھڑایئے۔ شعور کی آنکھ کھول کر اسلام کی متعین کردہ حدود پر قانع ہو کر عافیت بھری زندگی اختیار کیجیے۔ مرعوبیت کا تریاق خود اعتمادی کے عملی اظہار میں ہے۔ شاید یہ کتاب اس تریاق کے کچھ قطرے فراہم کر دے۔ جو چومکھی جنگ لڑتی عورت کے تنے ہوئے اعصاب کو اسلام کی حیات بخش سکینت دے کر پُرسکون کر دے!

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں سلیم منصور خالد صاحب نے جس دل سوزی سے مدد اور رہنمائی کی اس کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں اور اللہ تعالیٰ سے بہترین جزا کی درخواست گزار ہوں۔

عامرہ احسان

اسلام آباد

پیش لفظ

گذشتہ دو صدیوں سے جن موضوعات پر مغربی مفکرین اور مغرب سے متاثر مسلمان دانش وروں نے خصوصی توجہ دی ہے، اُن میں اسلامی معاشرے میں عورت کے مقام و کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ایک مشہور عربی دان یورپی نے جو عربی قاموس کا مؤلف بھی تھا اور اس نے اسلام کے حوالے سے ڈیڑھ صدی قبل یہ بات کہی تھی کہ اسلام کا ایک کمزور پہلو خواتین کو کم تر درجہ دینا ہے۔

یہ افسانہ طرازی کوئی آج کی بات نہیں ہے بلکہ صدیوں سے شاید ہی کوئی مغربی تحریر ایسی ہو جس میں اسلام میں عورت کے ساتھ نا انصافی، تفریق اور مرد کے مقابلے میں کم تر ہونے کا الزام عائد نہ کیا جائے۔ یہ بات اتنی مرتبہ اور اتنے وثوق سے کہی جاتی رہی ہے کہ اب خود مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ اسے درست مانتے ہوئے بالعموم ایک معذرت پسندانہ رویہ اختیار کرتا ہے یا جوشِ تجدد میں ایک 'روشن خیال' اور مغربی فکری آقاؤں کے لیے قابلِ قبول اسلام کی تصنیف کی دعوت دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جہاں ان حضرات کی اسلامی مصادر سے کم آگاہی کا حصہ ہے وہاں اس کی بڑی ذمہ داری خود مسلمان دانش وروں خصوصاً تحریکاتِ اسلامی سے وابستہ اہلِ علم افراد کی ہے۔ مولانا مودودی مرحوم اور محمد قطب نے جس طرح بغیر کسی معذرت کے قرآن و سنت کے بنیادی تصورات اور عصری مسائل پر اظہارِ خیال فرمایا

اور عالمی طور پر لاکھوں افراد کی فکری رہنمائی کی ہمیں آج وہ ولولہ نظر نہیں آتا۔ اس کے مقابلے میں ہر گلی کوچے میں حقوقِ نسواں اور خصوصیت سے مساواتِ مرد و زن کے نام پر بہت مختصر علمی قد و قامت رکھنے والوں نے بھی اسلام میں خواتین کے ساتھ نا انصافیوں کی ایک خیالی فہرست تیار کر کے اسلام میں تعمیرِ نو کا نعرہ بلند کر رکھا ہے۔

اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ خواتین جو قائد تحریکِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر سے متاثر ہوں آگے بڑھیں اور پورے اعتماد اور علمی وثوق کے ساتھ عصری مسائل پر اظہارِ خیال کریں۔ 'اکیسویں صدی اور مسلمان عورت' اس حیثیت سے ایک بہت خوش کن کوشش ہے کہ اس میں سید مودودی کے اس دینی اور فکری شعور کے زیر اثر ابھرنے والی ایک باشعور مسلمان بیٹی نے قرآن وسنت کے حوالے سے مسلمان عورت کے مقام و کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

نظری حیثیت سے موضوع پر بے شمار علمی تحریرات موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جن مسائل کی طرف مصنفہ نے تیسرے باب کے آخر میں توجہ دی ہے اس پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔ اپنے مخصوص انداز میں مصنفہ نے بعض معاملات کی حکمت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ عدالت میں گواہی عورت پر اس طرح فرض نہیں کی گئی جس طرح ایک مرد پر کی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۸۲ میں مال اور تجارتی معاملات کے حوالے سے جو اصول طے کیا گیا ہے وہ مطلق نہیں بلکہ مخصوص ہے۔ بلاشبہ اس آیت مبارکہ میں بات کہی گئی ہے کہ ایک تجارتی معاہدہ کرتے وقت اپنے میں سے دو مردوں کو شاہد بناؤ اور اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو ساتھ ہی یہ بات بھی کہہ دی گئی کہ یہ اس لیے ہے کہ اگر ان میں سے ایک یاد نہ رکھ سکے تو دوسری یاد دلا سکے۔ اس کی ایک ظاہری تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ اس آیت کی بنا پر دو خواتین کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار پاتی ہے۔ لیکن یہ تعبیر کرتے وقت ہم یہ

بھول جاتے ہیں کہ قانونِ شہادت کا تذکرہ صرف ایک آیت میں نہیں ہے۔قرآن کریم نے دیگر مقامات پر مختلف صورتوں میں شہادت کے لیے تعداد کا تعین مختلف کیا ہے۔اس لیے محض ایک آیت کو بنیاد بنا کر ایک مطلق اصول قائم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے کہ قتل، زنا، سرقہ، قذف یا عام شہادت عینی کے حوالے سے قرآن وسنت نے ہر واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے شہادت دینے والوں کی تعداد کا تعین کیا ہے۔مثلاً اخلاقی جرائم میں زنا کے لیے چار شاہدوں کا تعین کیا گیا جبکہ مالی معاملات میں محض دو مرد کافی سمجھے گئے۔لعان کی شکل میں تین مرتبہ اپنی صداقت کا اعلان اور چوتھی مرتبہ لعنت کا ذکر آیا۔یہ نہیں کہا گیا کہ مرد کے مقابلے میں عورت چھ مرتبہ شہادت دے۔قتل کی صورت میں اگر وقوعہ کے وقت گھر کی صرف ایک خاتون موجود ہو اور وہ شہادت دے تو اسے نصف نہیں مانا جائے گا بلکہ مکمل شہادت شمار کیا جائے گا۔کسی کی ولادت کے بارے میں تنازعہ کی شکل میں تنہا ایک عورت کی گواہی جو ولادت کے وقت موجود ہو قانون کی نگاہ میں پانچ ایسے قوی ہیکل مردوں کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہوگی جو واقعے کے عینی شاہد نہ ہوں۔ایسے ہی رمضان کے چاند کے نظر آنے اور شوال کے چاند کے نظر آنے میں بھی کم از کم شہادت کا تعین جنس کی بنیاد پر نہیں کیا گیا بلکہ واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے کیا گیا۔مختصر یہ کہ اسلام کے قانون شہادت میں بنیاد جنس نہیں ہے جبکہ مسئلہ کو الجھا کر جنسی تفریق سے متعلق کر دیا گیا ہے۔

قرآن وسنت پر مبنی اسلام کے اصول اتنے واضح، جامع اور عملی ہیں کہ یورپ اور امریکہ اپنے تمام نام نہاد مساوات کے نعروں کے باوجود ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔عصری مسائل، بالخصوص وہ موضوعات جن کا تعلق مسلم خواتین کے ساتھ ہے غیر معمولی توجہ کے مستحق ہیں۔ان پر غور کرنے اور عصری زبان میں تعارف کرانے میں خود مسلمان خواتین کی بھاری ذمہ داری ہے۔

زیرِ نظر کتاب ایک بہت صحت مند رجحان کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسلامی تحریکات کی فکری نمایندہ خواتین کو ان موضوعات پر خصوصاً آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے اس سے قطعِ نظر کہ اندازِ تحریر طنزیہ ہو، تیکھا ہو، نرم ہو، خالص علمی، تجزیاتی ہو یا تاریخی۔ ان موضوعات پر غیر معذرت خواہانہ انداز میں اپنی بات کو پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو توفیق دے کہ وہ اس قلمی جہاد میں بھرپور کردار ادا کرسکیں اور مغرب کی پیدا کردہ پراگندہ فکر کو سلامتی فکر کے ذریعے نہ صرف دور کریں بلکہ مثبت طور پر عصری زبان میں اسلام کی تعلیمات کو خواتین میں پھیلانے میں کامیاب ہوں۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد
وائس چانسلر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی
اسلام آباد

پیش لفظ (طبع دوم)

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی مکمل ہونے کو ہے۔ اس صدی میں داخل ہوتے ہوئے جو جھٹکا گلوبل ویلج نے ۹/۱۱ کی صورت میں کھایا تھا۔ اس کے اثرات سے نمٹتے نو سال ہونے کو ہیں۔ مغرب جو عورت کے حقوق کا سب سے بڑا چمپئن بنتا ہے، اس کے چہرے کے تمام نقاب اتر چکے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں جن خواتین کا چہرہ اس گلوب کی سکرین پر ابھر کر آیا ہے اُس میں تین نام نمایاں ہیں۔ ایک نام شہیدِ حجاب مروہ شربینی کا ہے جو مغرب کی تنگ نظری، انتہا پسندی اور مذہبی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بھری عدالت میں حجاب کے عوض موت اس پر جس سفا کی سے برسائی گئی، وہ عورت۔ اس کی آزادی، مساوات، حقوقِ نسواں، جنسی تفریق (Gender Discrimination) کے حوالے سے اٹھائے جانے والے غلغلے کی قلعی کھول کر رکھ دیتی ہے۔ آزادی سے مراد ......لباس سے آزادی ہے۔ مساوات سے مراد صنفِ نازک کو اس کی اصل ذمہ داریوں سے بیگانہ کر کے مرد کا دل بہلانے کے لیے زندگی کے ہر دائرے کے دھکے کھانا ہے۔ اس کا عملی مظہر 'جنسی تفریق' کا نعرہ ہے۔ جو اقوامِ متحدہ، اور بین الاقوامی سطح پر دی جانے والی ہمہ نوع امداد (ایڈ یا ایڈز کہہ لیجیے!) کا جزو لاینفک ہے۔ ڈالروں کے عوض مسلم معاشروں میں عورت کو ہر دفتر، بازار، سڑک پر لا کھڑا کرنے کی شرط ہے۔ کھیل کے میدان میں وہ نیم برہنہ ثانیہ مرزا کو مسلمان عورت کے لیے رول ماڈل بنا کر کھڑا کر رہی ہے۔ میڈیا پر بے پناہ تشہیر کے ذریعے نوجوان نسل کے اذہان منتشر کرنے، ان سے اُن کی عالی شان شناخت چھین کر ہوسنا کی کا استعارہ بنا کر گلوب کے چوراہے میں لا کھڑا

کرنے کی سازش ہے۔حقوق کے نام پر اسے مردانہ حقوق سے نوازنے کی کوشش میں مخنث گھڑے جا رہے ہیں۔اس کی فطرت کی پکار، اس کا فطری رول جس کے لیے اللہ نے اس کی جسمانی،نفسیاتی، روحانی ساخت رکھی تھی۔'ماں'...... 'ماتا' سے اسے محروم کیے جانے کو ترقی کی معراج باور کروانے کے لیے دنیا کے تمام بھونپو لگا رکھے ہیں۔ عالمی دن، کانفرنسیں، سیمینار، فلمیں، ڈرامے،نوجوان نسل کے اذہان کو منتشر اور بے راہ رو کرنے کے سارے اسباب فراہم کر رہے ہیں۔ مغرب میں یہ وہ نسل دنیا پر حکمران ہوئی ہے جہاں ترقی کے نام پر ماؤں کو گھر سے نکال کر باہر کیا اور تشنہ لب، محبت کو ترسی ہوئی جھاڑ جھنکار شخصیتیں پروان چڑھیں۔ ان کے ہاتھ میں اب دنیا کی قیادت ہے۔ دنیا امن،سکون، عافیت، بھائی چارے کو ترس رہی ہے...... درندے، بھیڑیے، دنیا پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اس عالمی گاؤں کا چوہدری عیاش، بدمعاش، انسانیت سے عاری ہے۔عورت اس کا سستا شکار ہے۔

گلوب کے چہرے پر دوسرا بدنما داغ ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر ڈھائے جانے والا ظلم ہے۔جرم بے گناہی کی سزا وہ امریکہ کے عقوبت خانے میں بے یار و مددگار سہہ رہی ہے۔عورت کے نام پر اربوں لٹانے والے اس مظلوم ترین عورت پر منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔اس کی حالت زار عورت کے نام پر اٹھائے جانے والے شور وغوغا کا منہ چڑا رہی ہے۔کیا حیادار مسلمان عورت،نسوانیت کے زمرے سے خارج ہے؟

گلوب کی سکرین پر ابھرنے والی تیسری صورت مریم (ایوان ریڈلی) کی ہے۔اعلیٰ تعلیم یافتہ، آزاد(Emancipated Empowered) صحافی خاتون۔جس نے طالبان کی صورت میں زندان میں اسلام میں عورت کا احترام، مقام اور حسن سلوک دیکھ لیا اور مغرب کے عطا کردہ تمام تر حقوقِ نسواں، اور مساوات کو لات مار کر اسلام کی ٹھنڈی، پر عافیت گود میں آ بیٹھی۔ اکیسویں صدی میں مسلمان عورت کی بات اُس سے کیجیے......اُس سے پوچھیے اور سر دُھنیے!

خاندانی نظام مغرب میں آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ شرحِ پیدائش خوفناک حد تک تیزی سے گر رہی ہے۔ یہ تہذیب اقبالؒ کی پیشین گوئی کے عین مطابق آپ اپنے خنجر سے خود کشی کر رہی ہے۔ لیکن ایک المیہ یہ ہے کہ موت کے گھاٹ اترتی رو بہ زوال تہذیب کے ہاتھ سے چھٹتا خنجر آج کا مرعوبیت زدہ، قرآن نا آشنا، سیکولر، مسلمان طبقہ لپک کر لینے کو تیار بیٹھا ہے۔ دوسری جانب مغرب اپنے ہاں اسبابِ زوال کو بے لاگ دیکھنے سمجھنے کی بجائے اسلام کا منہ نوچنے کو تلا بیٹھا ہے۔ اپنی تہذیبی گراوٹ کا ہر سطح پر دیوانہ وار اظہار کر رہا ہے۔ خواہ وہ توہین قرآن اور توہین رسالت کے اجڈ، گنوار مظاہرے ہوں یا مسجد کے میناروں پر پابندی اور حجاب، نقاب کو دیکھ کر پڑتے دورے۔ ہوں۔ عسکری سطح پر تیسری دنیا کے کمزور ترین ملک پر دس سال ہر ستم آزمانے کے بعد جس عبرت ناک ہزیمت کا انھیں افغانستان میں سامنا ہے وہ پوری دنیا کے لیے چشم کشا ہے۔ وہ اسلامی نظریۂ حیات کی بھی زبردست فتح ہے۔ عسکری محاذ پر ان فتوحات کے جھنڈے طالبان نے گاڑے ہیں تو نسوانی سطح پر اس نظریے کی قوت کا اظہار ایوان ریڈلی کی صورت میں موجود ہے۔ زیر نظر کتاب اسی سرچشمۂ حیات کی طرف پورے اعتماد سے رجوع کرنے کا پیغام ہے۔

میری خواہش ہے کہ لڑکیوں کو میٹرک کی عمر میں یہ کتاب پڑھوا دی جائے تا کہ زندگی کے 'مردانہ وار' کیریئر کے فیصلے کرنے سے پہلے زندگی کے امتحان میں اپنا مقام اور کردار جان لیں۔ مغرب کی اندھی تقلید کے پیچھے دوڑ میں حصہ لینے سے پہلے خالق مہربان کے عطا کردہ چشمہ صافی سے بھی چند گھونٹ بھر لیں۔ شاید وہ بروقت صحیح سمت اختیار کر سکیں اور ایک پر سکون، محفوظ، وقار اور قرار کی زندگی، جوان کی فطرت کی عمیق پکار ہے...... اُسے پا لیں!

عامرہ احسان

(اسلام آباد)

❁❁❁

ایک رہنما کتاب

اگر اُمتِ مسلمہ کی موجودہ روش کا تجزیہ کیا جائے تو اس تجزیے کا حاصل یہ نکلے گا کہ جو طبقہ اُمتِ مسلمہ کی قیادت و رہنمائی کے منصب پر مامور ہے وہ مغرب کی تہذیب، اُس کے افکار و نظریات اور اُس کے دنیاوی عروج سے مرعوب ہے۔ ان قیادتوں نے خود کو خام مال کے طور پر یورپ کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ ان کو جس قالب میں چاہے ڈھال دے اور جس اندازِ زندگی کا چاہے خوگر بنا دے۔ یہ مرعوب ذہن کی قیادتیں ہمیں ماضی سے ورثے میں ملی ہیں۔ اگر چہ یہ ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے مگر چونکہ سارے وسائلِ حیات اور ملکی پالیسیاں بنانے اور چلانے کے سارے اختیارات اسی اقلیت کی تحویل میں ہیں اس لیے اُمتِ مسلمہ کی وہ غالب اکثریت جو دل سے اسلام کی بالادستی اور قرآن کی رہنمائی کے مطابق زندگی گزارنے کی تمنائی ہے، اپنے وسائل کی کمی، اور یک جہتی کے فقدان کی وجہ سے کم از کم گذشتہ ایک صدی سے اپنی حقیقی منزل کا تعین کرنے سے محروم ہے۔ یہ مسلمان چاہتے ہیں کہ مسلمان بنیں مگر معاشرے کو غیر اسلامی روش پر چلانے والے ایسا جال بچھائے بیٹھے ہیں کہ درست اقدام کرنے اور درست بات سوچنے والے محض آرزوؤں اور تمناؤں کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اس ساری صورتِ حال کی بالکل صحیح صحیح عکاسی محترمہ عامرہ احسان نے کی ہے۔ انھوں نے موجودہ دور کی مسلم خواتین کے حوالے سے نہایت خوبصورت تجزیہ بھی کیا ہے، اُمت کو لاحق بیماری کی تشخیص بھی کی ہے اور اس کا علاج تجویز کرنے میں بھی

وہ بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں۔ اُن کی مختصری کتاب ''اکیسویں صدی اور مسلمان عورت'' ایک ایسی علمی خدمت ہے کہ جس سے ان شاءاللہ خیر و بھلائی کے سوتے رواں ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ایک خاتون کی تبدیلی ایک پورے خاندان میں انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اور اصلاحی انقلاب کبھی طوفان کی طرح نہیں آتے بلکہ یہ تو فرد سے فرد کی طرف اصلاح کا سفر ہے جو اسی طرح چلتا ہے کہ چراغ سے، چراغ جلتا ہے اور یہ جلتے ہوئے چراغ صبح کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ عامرہ احسان اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں اور اپنے کلام و قلم کے اعتبار سے ایک زوردار بانگِ رحیل قافلۂ جہاد بھی۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں بھی مقدور بھر اسلام اور خواتین کی نمایندگی کا حق ادا کیا۔ اسلام اُن کا آئیڈیل ہے اور اللہ نے انھیں اس آئیڈیل میں غور و فکر کرنے والا دماغ بھی دیا ہے اور اس کی تعلیمات کے حصول اور فروغ کے لیے جوش و جذبے کی فراوانی بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ محض فلسفیانہ باتیں نہیں کرتیں بلکہ اپنی باتوں کو مضبوط اور منطقی دلائل سے واضح کرنے کا اسلوب بھی جانتی ہیں۔ اُن کی بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں اتر جاتی ہے، یہی ان کے جذبۂ اخلاص کی دلیل ہے۔

موجودہ کتاب میں انھوں نے حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ عورت کی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں پر بڑی ہی پُر معنی بحث کی ہے۔ کتاب کو تاریخی دلائل سے سجایا بھی ہے اور اس تجزیہ کے دوران مسلمان عورت اور یورپ زدہ عورت کے فکری خدوخال پوری طرح واضح کیے ہیں۔ جہاں انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں عورت کے فطری مقام کو واضح کیا ہے اور اس کے بہترین نتائج کو نئی نسل کے سامنے رکھا ہے، وہیں یورپ کے علمی ماخذ اور مستند کتابوں کے ذریعے خواتین کو دوسرے رُخ سے بھی باخبر کیا ہے۔

اسلام تربیتِ اطفال کی صورت میں مستقبل کے اچھے انسان اور اچھے مسلمان فراہم کرنے کی جو ذمہ داری خواتین کے سپرد کرتا ہے اگر دیانت داری سے اُس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے پورا کر دیا جائے تو اُمتِ مسلمہ کے تمام مسائل حل کیے جاسکتے

ہیں اور ساتھ ہی اس عالمی فساد کی موجودہ فضا کو بھی امن سے بدلا جا سکتا ہے لیکن یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری نے آنکھوں کو خیرہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے یورپ کی عورت کو دیدۂ بینا سے محروم کر دیا اور وہ اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ کسبِ معاش کا مردانہ بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھا کے خوش ہو گئی کہ اسے مرد سے برابری کا اعزاز مل گیا جبکہ یہ اعزاز نہیں تھا بلکہ دامِ ہم رنگِ زمیں تھا جس نے مغرب کا سارا سماجی ڈھانچہ اس حد تک منہدم کر دیا ہے۔

یورپ نے فطرت کے خلاف اپنی بغاوت کی سزا غیر مطمئن نسل کی صورت میں دیکھ بھی لی ہے اور اب وہ اس کے نتائج بھی بھگت رہا ہے۔ مسلم حکمران اور مغرب کے الحاد و اباحیت زدہ ماحول کی اسیر چند خواتین مسلم معاشرے کی خواتین کو بھی اسی راستے پر ڈالنا چاہتی ہیں۔ ایسے وقت میں ایک ایسی رہنما کتاب کی ضرورت تھی جو ناصحانہ انداز رکھتی ہو اور جسے جدیدیت کے مرعوب زدہ ذہن کے ساتھ نہ لکھا گیا ہو بلکہ صرف قرآن و سنت ہی اس کی رہنما ہو۔ اللہ نے یہ خوبی اس کتاب کی مصنفہ عامرہ احسان کو بڑی فراخ دلی سے عطا کی ہے۔ وہ مغرب میں جاری عورتوں کے خلاف عہدِ جدید کی مردانہ سازشوں کو بے نقاب کرتی ہیں اور اس کے لیے خود مغربی مفکرین اور مغربی خواتین کے افکار و خیالات سے استدلال کرتی ہیں۔ تن آسان مرد کی سازش کے عنوان سے چند نکات بیان کرتے ہوئے عامرہ احسان کہتی ہیں: ''درحقیقت حقوقِ نسواں، مساوات اور آزادی کے پس پردہ مغرب میں مرد کی سازش یہ ہے: (۱) عورت اسے جنسِ ارزاں کے طور پر میسر آجائے۔ عورت اس کی کمزوری، اس کی طلب اور چاہت ہے لہٰذا وہ اپنی سفلی خواہشات کے تحت دفتر، بازار ہر جا اسے میسر پائے۔ (۲) مرد کی تن آسانی: اس دور میں عورت کو اکسانے والے وہ مرد ہیں جو اپنی تن آسانی کی خاطر اپنی بے پناہ ذمہ داریوں سے جی چراتے ہیں۔ اپنے حصے کا آدھا بوجھ عورت کے نازک شانوں پر شانہ بشانہ ترقی اور آزادی کے خوبصورت نام سے لاد دے ہوئے

ان کی نمائش نہ کرتی پھرو۔

ہر گھر معاشرے کا ایک یونٹ (Unit) ہے۔ اگر یہ یونٹ بگڑ گیا تو یہ بگاڑ آہستہ آہستہ پوری سوسائٹی میں پھیل جائے گا۔ یہ بھی ایک قسم کی آلودگی ہے جو اندر ہی اندر گھروں کو اوران کے سکون کو کھا جاتی ہے، گھر کی جنت کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اسی لیے سورۂ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ نور، سورۂ احزاب اور سورۂ طلاق میں اس پر زور دیا گیا کہ اس مورچے کو سب سے مضبوط ہونا چاہیے۔ خشت اول اگر غلط ہوئی تو پوری عمارت غلط ہو کر رہ جائے گی۔ اسی لیے حضرت علامہ محمد اقبال نے مسلمان خاتون کو مخاطب کر کے فرمایا۔

بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ درآغوش شبیرےؓ بگیری

یعنی بتول بن جا اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی مانند زمانے کی نظروں سے خود کو چھپا کر رکھ، تا کہ حضرت امام حسینؓ جیسے فرزانے تیری آغوش میں پروان چڑھیں۔ عربی زبان کی مشہور کہاوت ہے بیٹیاں خوشبو ہوتی ہیں خود پردے میں رہتی ہیں، کسی کو نظر نہیں آتیں لیکن ان کی بہترین گھرداری، ان کا سلیقہ، تھوڑے سے پیسوں میں بنائی ہوئی بہت ساری عزت اور سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت سب کو نظر آتی ہے اور بیٹے شیر ہوتے ہیں جو اپنے کچھار یعنی وطن کے محافظ ہوتے ہیں۔

آج اسی مورچے کو تباہ کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں، اسی محفوظ قلعے میں نقب لگانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اسی خوشبو کو چرانے کی سعی ہورہی ہے۔ اخبارات ورسائل، ٹی وی پروگرام، کمرشل اشتہار، ڈرامے، کیٹ واک اور میراتھن ریس...... یہ سب مل کر مسلمان خاتون کو یہ یاد کرارہے ہیں کہ باپ، بھائی، خاوند اور بیٹا یہ سب تمھاری آزادی کے دشمن ہیں، تم کو گھر کی چاردیواری میں قید کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں فاضل مصنفہ محترمہ عامرہ احسان صاحبہ نے کمال مہارت اور بڑی عرق ریزی سے اس مورچے کو، اس قلعے کو یعنی گھر کو سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط بنانے کے گر بتائے ہیں اور عصرِ حاضر کے تمام فتنوں کی نشان دہی کرتے ہوئے آج کی برگر نسل (Burger Genration) کو بتایا ہے کہ جہاں پہنچ کر امریکہ اور یورپ کی بگڑی ہوئی تہذیب سرگرداں ہے کہ اب جہاں آ پہنچے ہیں وہاں سے لوٹیں تو کیسے لوٹیں؟ اَیْنَ الْمَفَرُّ ۝ کَلَّا لَا وَزَرَ (القیٰمۃ ۷۵:۱۱) جس تباہی و بربادی کے ھاویۃ میں آ گرے ہیں اس سے کیسے نکلیں؟ لیکن افسوس صد افسوس وہیں پہنچنے کے لیے ہم بے قرار ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا پر اس تبصرے کو ختم کرتی ہوں کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّایَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَّفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا یُسْتَجَابُ لَھَا۔ یعنی اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع نہ دے (بلکہ الٹا نقصان دہ ہو۔ ہماری موجودہ تعلیم کی طرح جو صفر جمع صفر برابر صفر ثابت ہو رہی ہے) اس دل سے جس میں تیرا ڈر نہ ہو اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو اور اس دعا سے جو منہ پر ماردی جائے۔

اللہ تعالیٰ محترمہ عامرہ احسان صاحبہ کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بڑی محنت سے مسلمان خواتین کی رہنمائی فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کیا چاہتے ہیں اور کن فتنوں سے انھیں خود کو بھی اور اپنے خاندان کو بھی بچانا ہے جو زن کو نازن بلکہ ناگن بنا دیتے ہیں!

حمیرا ابوالاعلیٰ المودودی

جمعرات ۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ء

عورت: مباحثوں کے گرداب میں

ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں اس کا المیہ یہ ہے کہ عورت کے مقام اور کردار کے حوالے سے اتنی بحث ہوئی ہے کہ ہمیشہ سے طے شدہ مسائل بھی متنازعہ فیہ ہوگئے ہیں۔ دنیا سمٹ کر مختصر ہوگئی ہے۔ جغرافیائی بُعد اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ گلوبل ویلج کی اصطلاح اس پورے تصور کو واضح کرتی ہے کہ گویا پوری دنیا ایک گاؤں کی مانند ہوگئی ہے۔ جس میں ایک غاصب تہذیب کا کلچر پوری دنیا پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ وہی پیپسی، مرنڈا، برگر، جین، جوگر، ٹی شرٹ، فلم، موسیقی کا کلچر شرق تا غرب تمام ممالک کو یکساں طور پر لپیٹ میں لے چکا ہے۔

یورپ، امریکہ کی خدا بے زار کافرانہ تہذیب، ہندوستان کی مشرکانہ تہذیب بیشتر بیڈرومز میں دخیل اور بچوں کی دو انگلیوں کی رسائی میں ہے۔ خواہ وہ انگلیاں ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹیلی ویژن کے چینل بدل رہی ہوں یا کمپیوٹر کے ذریعے نیٹ پر رواں دواں ہوں۔ اس پر مستزاد 'اکیسویں صدی کے تقاضوں' کا غلغلہ ہوّا بنا کر اعصاب پر سوار کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس صدی میں کوئی سرخاب کے پَر نہیں لگے ہوئے۔ یہ صرف ایک نفسیاتی حربہ ہے جس سے مسلمان ذہن کو مغلوب اور مرعوب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ورنہ بہ زبانِ اقبال۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ جدید و قدیم

صدیوں کے سفر میں یہ تمام تر تبدیلیاں صرف ظاہر اور خارج میں آئی ہیں جبکہ انسان رتی برابر بھی نہیں بدلا۔ وہ آج بھی اسی مٹی سے بنا ہے، وہی اجزاے جسمانی لیے ہوئے ہے جو ہزار ہا برس قبل تھا۔ اس کی شخصیت کے بنیادی اجزا میں نیکی اور بدی آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسے ازل سے تھی۔ قابیل کا حسد آج بھی ہابیل کے درپے ہے۔ نمرود اور فرعون کا تکبر اور ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' (النّٰزعٰت ۷۹:۲۴) کا گھمنڈ آج بھی قائم ہے۔ صرف نام، القاب اور مقام بدلا ہے۔ فطرت عین وہی ہے۔ قارون کی زر پرستی اور زر اندوزی جوں کی توں ہے۔ زر، زن، زمین کا تعاقب کرتا انسان کل بھی یہی تھا۔ پہلے ظواہر سادہ، اجڈ اور کھرے، کھردرے تھے۔ فرق یہ ہے کہ آج یہ سب نہایت حسین، جدید اور سائنسی حربوں پر مبنی ہیں۔ گویا صرف تکنیک بدلی ہے۔ اصل عین وہی ہے۔

راگ، رنگ، موسیقی، آج کلچر کے نام اور سائنسی آلات سے مزین ہو کر جدیدیت کا روپ بھرے ہوئے ہیں۔ عریانی فحاشی بھی کوئی نئی نہیں۔ کیٹ واک ضرور نئی ہے، اس کے پس پردہ سفلی جذبات جو کل تھے وہی آج ہیں۔ چنگیز، ہلاکو کی ہلاکت خیزیاں سائنسی لبادے اوڑھ کر اپنی قہر انگیزی میں بے پناہ قوی ہو چکی ہیں۔ ان کے سپاہی خون کے دریا بہاتے، کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے تھک کے چور ہو جاتے اور درندے کہلاتے تھے۔ آج ایک ہوائی جہاز، ایک ڈیزی کٹر، ڈرٹی بم، ایک پائلٹ، چشمِ زدن میں وہی قیامت ڈھاتا گزر جاتا ہے۔ مگر اتنا ظلم کرنے کے بعد بھی وہ مہذب، روشن خیال اور عالی نسب رہتا ہے۔ دورِ یوسف علیہ السلام کی مصری بیگمات کی روشن خیالی آج بصد اہتمام لانے کے لیے اکیسویں صدی پورا زور لگا رہی ہے۔ گویا کچھ بھی تو نیا نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب دیکھ کر یقین دو چند ہو جاتا ہے کہ بے یار و مددگار سسکتی، بلکتی، بھٹکتی انسانیت کے لیے تریاق ہے تو صرف اسلام میں اور قرآن میں، جس سے دور رکھنے کی ساری سازشیں خود مسیحا کو بیمار سے بیمار تر کیے جا رہی ہیں۔ اس بیماری کا شدید ترین حملہ جس وجود پر ہو رہا ہے وہ امت مسلمہ کی عورت ہے جس کی شفا میں امت کی شفا اور جس کی ہلاکت میں امت کی موت ہے۔

عورت کا استحصال

آج عورت کو آزادی، حقوق، شانہ بشانہ، فعالیت کی اصطلاحات نے خوب خوب سبز باغ دکھا کر لوٹا ہے۔ اس پر مستزاد اب روشن خیالی اور اعتدال پسندی اسے دو آتشہ بنانے کو کافی ہے۔ ''عضو معطل'' کا طعنہ بھی غیرتِ زنانہ کو للکار کر ''میدانِ عمل'' میں لا کھڑا کرنے کو تیر بہدف ہے۔ اخبار، رسائل، سیمی نار، ورکشاپس، ویمن سٹڈی سینٹرز، سبھی نے مل کر وہ طوفان اٹھایا ہے کہ اسلامی حدود، قوانین، معاشرت، قواعد و ضوابط سب کچھ دھندلا کر رہ گیا ہے۔

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

جھانسہ

عالمی نظام کے تحت قرضے پہلے صرف معاشی پالیسیوں کے خدوخال پر اثر انداز ہوا کرتے تھے۔ اب یہ دباؤ زندگی کے ہر شعبے میں ہر سطح پر ڈالا جا رہا ہے۔ صنفی امتیاز (discrimination) ختم کرنے کے نام پر ریاستی قرضے ہر دائرہ کار میں عورت کو لا کھڑا کرنے سے مشروط کیے جا رہے ہیں۔ ہر سطح پر اختلاط کو حقوقِ نسواں کے حوالے سے مسلط کیا جا رہا ہے۔ سرکاری اداروں میں روزگار، ملازمت کے کوٹے میں، خواتین کو لازمہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ رجحان اب عورت کو ہوٹل میں بیرا گیری، سٹور میں کیشیئر، کوچ / بس سروس میں مہمان دار، حتیٰ کہ اب پٹرول پمپ پر پٹرول ڈالنے کی خدمات پر مامور کر رہا ہے۔ ترقی اور آزادی کے جھانسے تلے مغرب میں تعلیم کے لیے دیے جانے والے سکالرشپ میں در پردہ ترجیح لڑکیوں کو دی جا رہی ہے۔ مغربی مفادات کی محافظ غیر سرکاری تنظیمیں (NGO)، مغرب کے سفارت خانے، اقوامِ متحدہ کے دفاتر، ملٹی نیشنل

کمپنیاں، خواتین کو بھاری تنخواہوں پر ترجیحاً بھرتی کر رہی ہیں۔

گھمبیر معاشرتی مسائل

آج مرد عورت کا باہمی تعلق، معاشرے میں عورت کا کردار سبھی کچھ داؤ پر لگایا جا رہا ہے۔ یونی ورسٹی، اعلیٰ تعلیمی اداروں سے پڑھ کر نکلنے والی لڑکیوں کو ہاتھوں ہاتھ بھاری مشاہرے پر ملازمت مل رہی ہے۔ دوسری جانب لڑکا ڈگری تھامے روزگار کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے، یا پھر کمتر تنخواہ پر سرکاری نوکری پر اکتفا کر رہا ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مرد کی نوکری تو گھر، خاندان کی معاشی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے اور عورت کی نوکری اکثر وبیشتر لباس، میک اپ، تعیشات کی نذر ہوتی ہے۔ لڑکے بسا اوقات خاندانی معاشی مسائل کے ہاتھوں تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکر روزگار میں مبتلا ہو جاتے ہیں جبکہ لڑکیاں فراغت کے مشغلے کے طور پر ڈگری پر ڈگری لیے چلی جا رہی ہیں۔ عملی زندگی میں حقائق کا جب سامنا کیا جاتا ہے تو عورت اپنی ڈگری اور تنخواہ سے اعلیٰ تر ڈگری اور تنخواہ والے شوہر کی توقع رکھتی ہے۔ جو خاندان، گرد وپیش میں عنقا ہو جاتا ہے، وہ بے چارا اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے لہٰذا، اب یہ بی بی ہر رشتے پر انکاری ہے (اگر بہتر تربیت نہ ہو تو تعلیم اور معاشی استحکام خودسری بھی سکھاتی ہے۔ وہ دور لد گیا جب بچی کے سامنے رشتہ رکھ کر اس کی خاموشی کو اقرار رپسندیدگی کے معنوں میں لیا جاتا تھا!) موزوں رشتے کی تلاش میں والدین کے بال سفید اور لڑکی کے براؤن ہونے لگتے ہیں۔ جملۂ معترضہ کے طور پر...... یہ الگ بات ہے کہ عورت کا ایم-اے جو صرف کتابی پڑھائی پر مبنی ہوتا ہے بیش تر صورتوں میں دنیا کا عملی تجربہ، فہم اور ذہانت رکھنے والے سرد گرم چشیدہ مرد کے ایف-اے کے برابر ہوتا ہے۔

شادی کی عمر گزرنے لگتی ہے۔ معاشرے میں اب ملازمت پیشہ بڑی عمر کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو ڈھلتی جوانی میں بالآخر ہم پیشہ مردوں

کی دوسری بیویاں بننے پر مجبور ہو جاتی ہیں رمجبور کر دی جاتی ہیں۔ وہ تمام مسائل جو مردوزن کے اختلاط سے مغرب میں پیدا ہو چکے تھے اب پاکستان کا رخ کر رہے ہیں۔ دفاتر، اداروں میں خواتین سے چھیڑ چھاڑ، دست درازی کے روز افزوں واقعات عورت کے روایتی احترام کو تار تار کیے دے رہے ہیں۔

کلمہ تازہ کیجیے

مغربی قوتوں نے آزادیٔ نسواں کا جھنڈا عورت کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ گھر داری، بچوں کی دیکھ بھال پر تحقیر کا لیبل چسپاں کر کے مغرب نے اپنی ملحدانہ تہذیب اور فاسقانہ معاشرت کو پھیلانے کے لیے ہمارے گھروں پر، ہمارے داخلی محاذ پر ہمہ پہلو یلغار کی ہے۔ اسی پسپائی کا نتیجہ ہے کہ ہم محض دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ شکست خوردہ اندازِ فکر اور اندازِ استدلال نے ہمارے جداگانہ تشخص کو مجروح کیا ہے۔ ہمیں خود اعتمادی سے محروم کیا ہے۔ اس طرزِ فکر کا ابطال ضروری ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں زیرِ نظر تحریر مدافعانہ نہیں، حقیقت پسندانہ انداز سے اس موضوع کا جائزہ لینے کی ایک کوشش ہے۔

مغرب سے مستعار فکر کے بت کو لا کی ضرب (لا الہ الا اللّٰہ) سے منہدم کر کے ہم ایک مسلم عورت کے حوالے سے بات کریں گے وہ عورت کہ ؎

شرف میں مشتِ ثریا سے بڑھ کے خاک اس کی

ساری الجھن کی بنیاد ہی یہ ہے کہ ہم مغرب کی عینک سے مسلمان عورت کی جانب دیکھتے ہیں تو دماغ چکرا جاتا ہے۔ جس طرح غلط نمبر کی عینک صرف درست دیکھنے سے قاصر نہیں کرتی بلکہ دماغ بھی چکرا کر رکھ دیتی ہے۔ اسی طرح ہم ایک سرتاسر مختلف طرزِ حیات و تصورِ زندگی کو اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اس میں ناکامی پر اسلام کے ہی تار و پود بکھیر دینے پر تل جاتے ہیں۔ اقبالؒ کی یاد

دہانی تازہ کر لیجیے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

لہٰذا معاملہ از سرنو لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ سے شروع کرنے کا ہے۔ مغرب سے مستعار تصوراتِ زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر اِلَّا اللّٰـهُ کے طرزِ فکر کا بیج ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کے بعد ہی یہ بات سمجھ میں آئے گی ورنہ اندھیرے میں تیر چلاتے رہ جائیں گے۔

ہم حالت امتحان میں ہیں

ہمارے طرزِ زندگی کی بنیاد لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الملک ۲:۶۷) یہ آزمایش کہ تم میں سے بہتر عمل کرنے والا کون ہے، پر ہے۔ یقیناً مرد اور عورت، مرد اور مرد یا عورت اور عورت کے مابین مقابلہ تو ہے لیکن وہ مقابلہ نیکی، پاکیزگی، تقوے میں احسن تر ثابت ہونے کا مقابلہ ہے۔ اس حسن عمل کا نصاب قرآن اور سنت ہے۔ یہ دنیا ہمارا گھر نہیں ہے دارالامتحان ہے۔ مرد بھی امتحان دے رہا ہے عورت بھی حالت امتحان میں ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں معاملہ چھینا جھپٹی، باہم کشاکش کا نہیں ہے۔ میرے ہاتھ میں جو پرچۂ امتحان ہے مجھے وہ حل کرنا ہے۔ کمرۂ امتحان میں جو پرچہ ممتحن بنا کر تھما دیتا ہے، اس کے سوال پسند ہوں یا ناپسند، انھی کے جواب دینا ہوتے ہیں۔ انھی پر مغز ماری کرنا پڑتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سوال نامہ ہم ناپسند کردیں، پھاڑ دیں اور یہ کہیں کہ یہ سوال میری پسند اور ذوق کے نہیں ہیں۔ مجھے اپنا سوال نامہ خود سیٹ کرنا اور جواب دینا ہے۔ لہٰذا پرچہ پھاڑ کر نئے سرے سے اپنی پسند کے سوال اور ان کے جواب نہایت محنت، دل سوزی، ذوق وشوق سے دینے میں منہمک ہو جاؤں۔ یہ حل شدہ پرچہ جب ممتحن کے پاس جائے گا تو شاید یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ من مانے سوالات کے

جوابات دینے کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

آج کی مسلمان عورت بالکل یہی کام کر رہی ہے۔ اللہ نے جو سوال اس سے نہیں پوچھے۔ جو فرائض اس کے ذمے نہیں کیے وہ تو یہ بی بی نہایت خشوع وخضوع سے اپنے اوپر مسلط کر کے دن رات ایک کیے دے رہی ہے۔ اس کے برعکس جو پرچۂ امتحان اس کو سیٹ کر کے دیا تھا اسے اس نے پس پشت ڈال دیا ہے کیونکہ مغربی عورت کا خودساختہ پرچہ اسے پسند آ گیا۔ لہٰذا اس نے اس کے سوال نقل کر کے جواب دینے شروع کر دیے ہیں۔ حالانکہ مغربی عورت تو بے چاری لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک، ۶۷:۲) کی بنیادی تعلیم اور تصور سے ناآشنا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ اس بات سے نابلد کہ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے۔ وہ تو اس امتحان میں شریک ہی نہیں جسے آخرت کے مقابلے کا امتحان (بروزن CSS) کہا جاتا ہے۔ وہ تو ان پانچ بنیادی سوالوں سے بھی لاعلم ہے جو خاتم النبیین (ﷺ) نے ہمیں بتا کر آخرت کا پرچہ آؤٹ کر دیا ہے کہ تیاری کرلو۔ یہ سوال پوچھے جائیں گے:

۱- جسم کو کس کام میں گھلایا۔

۲- عمر کس کام میں استعمال کی۔

۳- مال کہاں سے کمایا۔

۴- مال کہاں خرچ کیا۔

۵- علم دین حاصل کر کے اس پر عمل کتنا کیا۔ (ترمذی)

اس پرچے کے لیے نصابِ زندگی قرآن اور سنت رسولؐ دے دیا گیا۔ مرد بھی اس کا پابند کر دیا گیا اور عورت بھی۔ اب دونوں ہی کو اس نصاب کے مطابق پرچۂ زندگی حل کرنا ہے۔ اب کہاں دُنیا کو کمرۂ امتحان سمجھ کر منضبط، سنبھلی ہوئی محتاط زندگی گزارنے والی مسلمان عورت۔ اور کہاں مغرب کی آزاد، شترِ بے مہار، لاعلم، نابلد، منچلی، بے قابو

عورت۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! یہ دو زندگیاں لازماً کلیتاً متضاد اور بُعد المشرقین کی حامل ہوں گی۔ لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ۔(الحشر ۶۰:۲۰) دوزخ کی تیاری کرنے والی اور جنت کی تیاری کرنے والی ایک سی کیونکر ہو سکتی ہیں؟ نہ دنیا میں کارکردگی/مشاغل/مصروفیات کے اعتبار سے اور نہ انجام کے اعتبار سے کہ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ جنت میں جانے والے/والیاں ہی کامیاب ہیں۔ لہٰذا مسلمان عورت کی کامیابی اور اس کی معراج دنیا...... اس کے کیریئر...... کسی دفتر میں اعلیٰ منصب...... کوہ پیمائی...... خلانوردی میں جھنڈے گاڑنا نہیں ہو سکتی۔ حدیث کے مذکورہ پانچ سوالوں کی روشنی میں جو دائرہ کار اس کا متعین کیا گیا، جو ذمہ داریاں اسے سونپی گئی ہیں، جن کے بارے میں اس سے سوال ہوگا، اسے تو بس انھی کی فکر کرنی ہے۔

لہٰذا اب اس حوالے سے خاندانی نظام میں عورت کا مقام دیکھا جائے گا۔

اسلام میں عورت اور مرد

اولاً تو اللہ تعالیٰ قرآن میں مرد، عورت سے یکساں خطاب کرتا ہے۔ مکی زندگی کے ابتدائی تیرہ سال دونوں کو یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ توحید، رسالت، آخرت کے اسباق دونوں کو ہی پڑھائے جا رہے ہیں۔ وہی ایک اللہ دونوں کا 'الٰہ واحد' ہے جس کی بندگی و اطاعت پر دونوں کی نجات موقوف ہے۔ دونوں کے لیے اللہ نے ایک ہی رسول مبعوث فرمایا ہے۔ جو ان کا تزکیہ کرتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ دونوں پر نبیؐ کی اطاعت یکساں واجب ہے۔ دونوں کو آخرت میں اللہ کے حضور فرداً فرداً اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ عورت مرد کا ضمیمہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ایک شناخت، انفرادیت، شخصیت، فرائض اور ذمہ داریاں رکھتی ہے جس کی پوچھ خود اس سے ہی ہوگی۔ مرد اس کی ترجمانی یا اس کے حصے کی جواب دہی نہیں کرے گا۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (النجم ۵۳:۳۸) ''کوئی بوجھ اٹھانے والا

دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ "لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلاَّ مَا سَعٰی۔ (النجم ۵۳:۳۹) ''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کے لیے اس نے کوشش کی۔'' لہٰذا عورت پوری دل سوزی اور یکسوئی سے اپنا پرچہ نصاب کی روشنی میں خود حل کرے گی اور مرد اپنے حصے کی ذمہ داریاں اور فرائض خود نبھائے گا۔

اس لیے نبوی دور میں ہم مرد و زن دونوں کو یکساں طور پر جنت کا طلب گار پاتے ہیں کہ دونوں کے لیے نیکی پر بشارت یکساں ہے اور بدی پر وعید ایک سی۔ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا:

میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان کے سب قصور میں معاف کردوں گا اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں، اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔ (۳:۱۹۵)

رفاقتوں کی داستان

لہٰذا درج بالا تعلیم اور وعدے کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مرد و زن دونوں نے آزمائشوں میں یکساں طور پر ثابت قدمی دکھائی۔ دونوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی تکلیفیں اٹھائیں، اللہ کی راہ میں حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ دونوں شہادت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ہجرت حبشہ میں حضرت عثمانؓ کے ساتھ حضرت رقیہؓ بھی نکلیں۔ پہلی مرتبہ گیارہ مرد اور چار عورتیں۔ دوسری مرتبہ ۸۳ مرد اور ۱۱ عورتیں حبشہ ہجرت کر گئیں۔ بعد ازاں ہجرت الی المدینہ میں بھی ابوسلمہؓ اور ام سلمہؓ کی اللہ کی راہ میں ستائے

جانے کی داستان معروف ہے۔ غرض اللہ کے فرمان کے مطابق وہ اولین گروہ جو رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے، **بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ (اٰل عمرٰن:۱۹۵)** کی عملی تفسیر ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ پھر یہی تعلق سورۂ توبہ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کہیں بھی باہم متصادم ...... باہم درپے آزار نہیں ہیں بلکہ......

''مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوش نودی انھیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔'' (التوبۃ۹:۷۱،۷۲)

یہ مکمل تصویر ہے مومن مرد اور مومن عورت کے باہم تعلق کی۔ اسلامی معاشرے کی تعمیر میں دونوں کے کرنے کے کاموں کی اور نتیجتاً دونوں کے لیے اللہ کی رضا، ہمیشگی کی جنت کے سدا بہار باغوں میں پاکیزہ قیام گاہوں کے یکساں وعدے کی بشارت ہے۔ جس کے حصول کے لیے مومن مرد اور مومن عورت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر قوتیں اور صلاحیتیں لگانے والے ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ اصل اور بڑی کامیابی ''فوزِ عظیم'' ہے جو مسلمان مرد و زن کی معراج ہے۔ بہ نسبت دنیاوی معرکوں میں عورت کے جھنڈے گاڑنے کی دیوانگی کے، یہ ہے وہ تصورِ حیات جو اسلامی نظامِ زندگی کو ایک نہایت پاکیزہ بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اسلام میں خاندان کی اہمیت

مدنی زندگی میں ہجرت کے بعد اسلامی ریاست وجود میں آتی ہے۔ احکام کا نزول ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اس معاشرے میں ہمیں واضح طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اسلام ایک مضبوط اور پائے دار خاندان کو معاشرے کی بقا کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ معاشرے کا بنیادی یونٹ ہونے کے اعتبار سے خاندان کا استحکام معاشرے کا استحکام ہے۔ اسلام خاندان کی تعمیر و تشکیل کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کرتا ہے اور اس کی زبردست حفاظت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر / خاندان۔ انسان سازی کا کارخانہ ہے..... خاندانی نظام کے تحفظ، سکون اور استحکام کے لیے ان گنت قوانین عطا کیے گئے ہیں۔

سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب کے تمام تر احکام خاندانی نظام کے تقدس کی حفاظت، گھر کی فضا کو سکون بخش بنانے کا لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ سورۃ النساء کے احکام گھر کے اندر کی فضا کو افہام و تفہیم، باہمی فضل، عفو و درگزر، احسان کے حسن سے آراستہ کرنے کا انتظام فراہم کرتے ہیں، تاکہ نسل انسانی کی بقا اور فروغ کی ضمانت مل سکے۔ خاندان کی حیثیت ایک صنعت کی سی ہے جس کا حاصل (Product) انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ، والدین کی جھولی میں خاک کا ڈھیر ڈال دیتا ہے کہ اس سے انسان گھڑ گھڑ کر معاشرے کو فراہم کردے۔ اگر یہ خاک اللہ کے خوف اور اس کی محبت سے گوندھی جائے اور قرآن کا نور اس میں شامل ہو تو حسنؓ اور حسینؓ جیسے ہیرے تراشے جاتے ہیں۔ عبداللہؓ بن عمر، عمرؒ بن عبدالعزیز بن کر معاشرے کی تزئین کا سامان لاتے ہیں۔ بصورتِ دیگر اس پیداواری یونٹ کی اللہ سے بے نیازی، بے خوفی اور قرآن سے دوری

معاشرے کو تاریکیوں سے بھر دیتی ہے۔ یک انبار گل آدم نہ شد۔

آج کی وہ فہرست جس میں آئے دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین اور اب آمنہ ودود اور اسرا نعمانی اسلام کے خلاف دریدہ دہنی، ہرزہ سرائی میں امت کو خود کفالت سے ہم کنار کیے دے رہے ہیں۔ واحد میدان جس میں خود کفالت حاصل کر لی گئی!

خاندانی نظام میں عورت کی دو حیثیتیں اس کے عرصۂ حیات میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں: بیوی اور ماں۔

عورت بحیثیت بیوی

عورت بیوی بن کر خاندانی نظام میں داخل ہوتی ہے۔ اس حیثیت میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو خاندان کا سربراہ، قوام، ذمہ دار اور کفیل بنا کر بھاری بھرکم ذمہ داریوں کا ایجنڈا اس کے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء ۴:۳۴) ''مرد عورتوں پر قوام ہیں۔''

مرد کو قوام بنایا یعنی نظام چلانے کا ذمہ دار۔ یہ آیت خواتین کے لیے آیتِ نجات ہے۔ سمجھنے کی ہی بات ہے۔ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ (البقرۃ ۲:۲۶) یہی ایک آیت آج بے شمار مغرب پرست خواتین کے لیے پریشان کن ہے۔ پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی ہیں کہ مرد کو اسلام نے بڑا بنا دیا اور مساوات دھری کی دھری رہ گئی۔ حالانکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا جائے تو یہ آیت مرد کے سر پر بظاہر بڑائی کا تاج رکھ کر تمام ذمہ داریاں اس پر لاد دیتی ہیں۔ عورت کی ناز برداری پر اسے مامور کر دیتی ہے۔ تمام مشکل، بوجھل، ناگوار کاموں کی مشقت سے عورت کو محفوظ رکھتی ہے۔ عورت کو گھر کی ملکہ بنا دیا جبکہ مرد کو اسے تحفظ، نگہبانی اور آرام و راحت دینے پر لگا دیا۔ کاموں اور ذمہ داریوں

کو ٹھیک ٹھیک تقسیم کر دیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ دنیاوی انتظام کی آیت ہے۔ فضیلت یا مرتبے کی آیت نہیں ہے۔ فضیلت کی بنیاد تو یہ ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط۔ (الحجرٰت ۴۹:۱۳) ''اللہ کی نگاہ میں تم میں سے لائق تکریم وہ ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔'' فرعون مرد تھا۔ حضرت آسیہ عورت تھیں۔ لیکن وہ مرد راندۂ درگاہ ہوا اور عورت نے تکریم اور عظمت پائی۔ ایمان و عمل درجاتِ حقیقی کی حد بندی کرے گا۔ یہ تو دنیاوی انتظام (administration) کیا گیا ہے۔

فرائض کی فکر کیجیے

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں۔ جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔ اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ (البقرۃ ۲:۲۲۸)

یہاں یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ دونوں پر یکساں طور پر ایک دوسرے کے حقوق ہیں۔ درحقیقت یہ ان فرائض کی یاد دہانی کروائی جا رہی ہے۔ مرد کا حق عورت پر اور عورت کا حق مرد پر کیا ہے۔ جواب دہی اللہ کے ہاں حقوق کی نہیں ہے، فرائض کی ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو مغرب کے تصورات اور اسلام کے مابین ہے۔ وہاں خواتین، مرد، مزدور، کسان غرض معاشرے کا ہر طبقہ اپنے ہاتھ میں حقوق کی فہرست تھامے پھرتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں فکر فرائض کی دی گئی ہے۔ مزید یہ بھی بتا دیا کہ اگرچہ مرد قوام ہے اور اسے ایک درجہ اونچا حاصل ہے لیکن اصلاً غالب اقتدار اللہ کا ہے۔ جس کے حضور مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر جواب دہ ہیں۔ درجہ بڑھا دیا لیکن یہ تاکید بھی کردی کہ عَاشِرُوْھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج (النساء۴:۱۹) بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْھُمَا وَتَشَاوُرٍ (البقرہ ۲:۲۳۳) مشورے اور رضا جوئی سے کام کرو۔ عورت گھر میں مرد کی دم ساز، ہم راز، ہم دم اور مشیر ہے۔ دونوں

ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ بلاشبہ وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ ...... لیکن آج عورت سے اس کی نسائیت چھین کر اس رنگ میں بھنگ ڈالی جا رہی ہے۔ یہ سارے امراض مغربی ہیں۔ ہمارے ہاں مرد حریف اور مدمقابل نہیں، رفیق کار ہے۔ یہ رشتہ رقابت کا نہیں رفاقت کا ہے۔

میاں بیوی کا باہم تعلق

اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کی بنیادی اکائی گھر کا تصور واضح فرمایا ہے:

''اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔'' (النحل ۱۶:۸۰)

یعنی جسے مغرب میں 'ہوم سویٹ ہوم' کہا جاتا ہے، وہ محض اس جملے کی تختی آویزاں کر دینے سے باعث راحت وسکون نہیں ہو جاتا۔ ایسا گھر جس میں مرد، عورت کے مابین حقوق کی چھینا جھپٹی اور کشاکش ہو وہ اکھاڑا اور میدانِ کارزار تو ہو سکتا ہے ہرگز جائے سکون نہیں ہو سکتا۔ کرسی کا جھگڑا اگر اس بنیادی یونٹ میں در آئے تو اس کا سارا سکون رخصت ہو جائے گا۔ لہٰذا گھر عطا کرنے سے پہلے اللہ نے اس کا نام رکھ دیا اور اسے اسم بامسمیٰ بنانے کی ذمہ داری دونوں پر گویا عاید کر دی۔ ''جائے سکون'' یہ ہے ایک اسلامی گھر کا بنیادی تصور۔ اس گھر میں زوجین ایک دوسرے کے لیے وجۂ سکون ہیں:

''تمھارے لیے تمھاری جنس سے بیویاں بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔'' (الروم ۳۰:۲۱)

شریعت کے مقاصد کی تکمیل ہمارے ایمان کے تقاضوں میں سے ہے، کہ ہم واقعتاً گھر کو ایک دوسرے کے لیے سکون کا گہوارہ بنا دیں۔ اگر انسان سازی کا یہ کارخانہ بے سکونی اور افراتفری کا شکار ہوگا تو اس سے بننے والی الجھی بکھری شخصیتیں نظامِ ہستی کے بگاڑ کا سبب ہی بنیں گی۔

مکان یا گھر

گھر، عورت سے بنتا ہے۔ عورت کے بغیر گھر محض ایک مکان ہوتا ہے۔ اس کی عملی مثال یہ ہے کہ ہمارے ہاں بچے گھر داخل ہو کر سب سے پہلے جسے تلاش کرتے ہیں وہ ''ماں'' ہوتی ہے۔ ماں گھر پر نہ ہو تو بچے کا منہ لٹک جاتا ہے۔ بلکہ باپ بھی گھر کی دہلیز پر کھڑا ہو کر بچوں سے پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ: ''بیٹا! امی کہاں ہیں۔'' گھر کا مرکز و محور، اسے راحت، سکون دینے والی ذات عورت ہی کی ہوتی ہے۔ یہ اس کی ذات کی کشش ہے کہ جس کی شیرازہ بندی سے گھر، گھر بنتا ہے۔ خدانخواستہ باپ کا انتقال ہو جائے تو عورت بچوں کو سنبھال کر پال پوس لیتی ہے لیکن گھر سے ماں چل بسے تو مرد، دھوبی، باورچی سب بن سکتا ہے مگر گھر کو سکون فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کی تمام تگ و دو ماں کی کمی پوری نہیں کر پاتی۔ آج دنیا کی سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ گھر کو گھر نہیں رہنے دیا جا رہا، گھر والی کو گھر سے بے گھر کر کے دفاتر، کارخانے آباد کر دیے گئے اور گھر برباد...... بے سکون بھائیں بھائیں کرتے مکان بن گئے۔ نتیجہ؟ خانہ خالی دیواں می گیرند...... لہٰذا خالی گھروں پر جنوں بھوتوں کا قبضہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب گھروں سے انسان کم اور جنات زیادہ برآمد ہو رہے ہیں۔

بہترین بیوی

گھر میں رہنے بسنے کا سلیقہ شوہر، بیوی دونوں کو سکھایا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نشان دہی فرما دی:

> وہ کہ شوہر اسے دیکھے تو خوش ہو جائے۔ کوئی بات کہے تو مان لے، اپنے نفس اور شوہر کے مال میں جس تصرف کو وہ ناپسند کرے اس کا ارتکاب کر کے اس کی مخالفت نہ کرے۔ (نسائی)

شوہر کو خوش کرنے میں ظاہر و باطن دونوں کا حصہ ہے۔ ظاہر بھی ایسا ہو کہ

دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ جو الجھے بکھرے بالوں، میلے کچیلے کپڑوں اور پیشانی پر سو بل والی بیوی کو دیکھ کر نہیں ہوسکتیں۔ آئیڈیل زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے باہر کی تمام تر ناگواریاں، بوجھ، ذمہ داریاں مرد کے کھاتے میں ڈال دیں۔ عورت کو اس سے محفوظ رکھا۔ اب جب یہ تھکا ماندہ گھر لوٹے تو بیوی کو باعث سکون و راحت ہی ہونا چاہیے۔ پارٹیوں میں جانے کے لیے تو سولہ سنگھار اور شوہر غریب کے لیے لہسن پیاز کے تڑکوں کی بدبو میں بسی، الجھی بکھری زوجہ محترمہ کوفت اور تھکاوٹ میں اضافے ہی کا سامان لائے گی، وجہ سکون نہیں بنے گی۔ بالخصوص آج کے دور میں جہاں بے پردگی نے فتنوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ چہار جانب بنی سنوری سجی عورت بازار میں، دفتر میں، سڑکوں پر، بڑے بڑے اشتہاری بورڈوں پر سے جھانک جھانک کر دعوتِ نظارہ دیتی عورت، سارے زیب و زینت کے ہتھیاروں سے لیس کھڑی ہے۔ ایسے میں گھر لوٹ کر تھکی، بجھی، مریل، بیزار، درپے آزار بدحلیہ بیوی مرد کے لیے یقیناً آزمائش ہے۔ چہار جانب بے پردگی، حیا باختگی کے اس معاشرے میں مرد کی حیا کی حفاظت کی ذمہ داری عورت پر فزوں تر ہو جاتی ہے۔ جس میں کوتاہی برتنے پر نبی رحمتؐ نے عورت کو فرشتوں کی لعنت کی وعید سنائی ہے۔ (بخاری، مسلم)

باہر اشتہا انگیز کھانوں اور فوڈ سٹریٹ سے گزر کر آنے والا گھر آئے تو رات کی باسی سوکھی روٹی اس کی منتظر ہو یا بھوک مٹانے کو کچھ میسر ہی نہ ہو تو ایسے میں چڑ چڑاہٹ، بدمزاجی اور frustration ہی جنم لے گی۔ فرشتوں کی لعنت ایسے میں بلا سبب نہیں ہے۔ عورت لباس ہونے کے اعتبار سے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ۔ (البقرہ ۲:۱۸۷) مرد کے لیے باعث راحت و زینت، اس کی عزت و حیا کی محافظ ہے۔

'نگاہ ڈالے تو خوش ہو جائے' کی یاددہانی عملاً ہمیں حضرت عائشہؓ کے اس استفسار میں بھی نظر آتی ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی اہلیہ آتی ہیں اور سراپے میں

سادگی اور بے تو جہی دکھائی دیتی ہے کہ زینت اور سنگھار نہیں ہے تو پوچھتی ہیں...... 'کیا عثمان کہیں گئے ہوئے ہیں'یعنی شوہر کے ہوتے ہوئے یہ بے نیازی نہیں ہوسکتی!

تاہم یہ معاملہ دوطرفہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ''میں اپنی بیوی کے ذوق کی تسکین کے لیے آراستہ پیراستہ رہنا پسند کرتا ہوں جیسا کہ خود میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرے لیے زیب وزینت سے آراستہ رہے۔ (یہ اس حدیث کا بھی عملی اظہار ہے کہ جس کے تحت مومن وہ ہے جو اپنے لیے پسند کرے وہی دوسرے کے لیے بھی چاہے)۔

ہمارے ہاں یہ تصور عنقا ہے۔ بیوی کا آراستہ ہونا تو پسند ہی نہیں لازم بھی ہے لیکن میاں جی دھوتی بنیان یا شلوار پرٹی شرٹ پہنے اجڑے بکھرے بالوں کے ساتھ کسی ویرانے کی تصویر بنے گھومتے رہیں۔ عورت کو شاید کور ذوق ہی گردانا جاتا ہے۔

'بات کہے تو مان لے' حدیث کا یہ دوسرا جز و گھر کے سکون کا سامان لاتا ہے۔ مختلف درجات کے مطالبے ہوتے ہیں۔ وہ مطالبے جو اللہ رسول کے احکامات سے متصادم نہ ہوں (معروف مطالبے) مانے جانے چاہییں۔ اسی میں گھر کا سکون ہے۔ جو مطالبات زیادتی پر مبنی ہوں انھیں احتیاط اور سلیقے سے رفع کیا جائے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ خصوصاً قرآن وسنت کی روح سے نابلد ہندو معاشرت کے گہرے اثرات کے حامل اس معاشرے میں آج ان گنت مطالبات وہ ہوتے یا ہو سکتے ہیں جو نامعقول اور بعض سرتا سر زیادتی پر مبنی ہوں۔ لیکن بہر صورت عورت کے لیے گھر کو 'جائے سکون' بنانے اور ابدی گھر کے حصول اور اجر آخرت پر نگاہ رکھ کر سلیقے اور احتیاط سے مطالبوں کو ایثار اور خدمت گزاری کے ذریعے بتدریج ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔ بحث مباحثہ، کٹ حجتی یا طعنہ زنی گھر میں فضا کو مکدر کر دیتی ہے۔ ایسی دھواں دھار فضا بچوں کے اندر تک اتر کر ان کی شخصیات پر بڑے گہرے داغ دھبے چھوڑتی

ہے لہٰذا اس سے گریز لازم ہے۔

آج کے نام نہاد مساواتی دور میں تعلیم یافتہ بیوی اکثر صورتوں میں شوہر کے لیے احترام، محبت اور اطاعت کا تصور نہیں رکھتی۔ 'اطاعت' کا لفظ ہی اس کی سماعت پر ہتھوڑے برساتا ہے جسے وہ اللہ کے لیے قبول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی منظور، والدین کے لیے گوارا کرسکتی ہے لیکن شوہر سے تعلق 'اطاعت' کا نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہ تعلق باہمی افہام وتفہیم اور دوطرفہ چاہت پر مبنی ہے۔ بہرصورت جو مقام اللہ تعالیٰ نے شوہر کا رکھا ہے اس کا پاس تو رکھا ہی جانا چاہیے۔ یہ تعلیم وتربیت ایک ان پڑھ دیہاتی گھروں میں کام کرنے والی ملازمہ کے ہاں دیکھی تو چشم حیرت وا ہوگئی کہ گویا یہ فطرت انسانی میں گندھی، الہام شدہ سچائیوں میں سے ایک ہے کہ اس کی بیٹی نے شوہر کی طرف پلیٹ لڑھکا دی تو ماں نے ٹوکا 'سر کے سائیں' کو ادب سے کھانا پیش کرتے ہیں لڑھکاتے نہیں ہیں۔' ہمارے ہاں 'سر کے سائیں' کی اصطلاح اور تصور ٹیلی ویژن کے ڈراموں کے اٹھائے گئے جھگڑوں، طوفانوں کی نذر ہوگیا۔ سرہمہ پہلو ننگے ہو گئے۔ جدید تہذیبی لہر میں شوہر اور والدین اب دوست بن چکے ہیں۔ لہٰذا دوستی دوستی میں حفظ مراتب کا سبق ہم بھول گئے۔ یہ بڑی خطرناک دوستی ہے جو حدِ ادب بھی بھلا دیتی ہے۔ بے تکلفی اور بے حجابی کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ بیوی شوہر کو گھر بھر میں یوں بے دھڑک آوازیں لگاتی پھرتی ہے گویا کوئی چھوکرا ہو، شوہر نہیں۔

'شوہر کے مال میں تصرف' تقابل کر کے دیکھیے تو مغربی عورت کے لیے شوہر کے مال تک رسائی ہی ایک احسانِ عظیم ہوتی ہے۔ وہاں والدین کے ہاں عورت بے چاری جونہی ذرا بڑی ہوتی ہے چڑیا کی طرح گھونسلے سے نکال باہر کی جاتی ہے کہ اپنے اخراجات اب خود اٹھاؤ۔ وہاں سے خود کمانے کا جو تسلسل شروع ہوتا ہے تو کماتی کماتی ہی شوہر کے گھر جاتی ہے (اگر شوہر کے گھر جانا نصیب ہوجائے) اور پھر 'میرے

پیسے' اور 'تمھارے پیسے' کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک امریکن خاتون نے حد درجے شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'آج کل میں بے روزگار ہوں۔ لیکن شوہر اتنا مہربان ہے کہ مجھے پیسے دیتا رہتا ہے!' ہمارے ہاں مرد (بالعموم) اپنی محنت کی کمائی پر تمام تر حق بیوی بچوں کا سمجھتا ہے۔ لاکر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے (الا ماشاءاللہ)۔ اس کی کمائی وہ پورے حق ملکیت کے ساتھ خرچ کرتی ہے (اگر چہ اب ہم انھی راہوں پر چل دیے ہیں جن پر ہمیں آزادی، مساوات کے نام پر دھکیلا جا رہا ہے اور تلخیوں کے وہی ذائقے، جھگڑوں کے وہی عذاب ہم بھی چکھ رہے ہیں!)

مرد کو قوامیت کا مقام بھی یہ کہہ کر دیا گیا ہے کہ ''مرد عورتوں پر قوام ہیں...... اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں'' (النساء ۴:۳۴) بڑے بڑے شہروں کی تہذیب دیکھیے تو مرد کا کام کمانا اور بیگمات کا کام خرچ کرنا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس کمائے ہوئے کو ٹھکانے لگانا ہے۔ یہ عیش وعشرت...... ڈرائیور گاڑی لے کر بازاروں میں گھومتے پھرنا۔ مرضی سے پرس کا منہ جس پر چاہے کھول دینا۔ مغربی عورت خواب میں بھی ایسی زندگی کا تصور نہیں کرسکتی۔ بڑے بڑے شاہانہ بنگلے، نوکروں چاکروں کی قطاریں۔ ہاتھ پر دھرا پیسہ، جو ہمارے ہاں بڑے شہروں کے پرتعیش علاقوں کا کلچر ہے (صحیح غلط سے قطع نظر)۔ یہ طرزِ زندگی تو ان کے ہاں بڑے بزنس والوں کی حد تک محدود ہے۔ عام عورت تو نوکریوں کے دھکوں میں دن رات ایک کرتی ہے۔ صبح سے شام تک روٹی کمانے کے چکر میں ہلکان ہوئی رہتی ہے۔ لہٰذا کون سا شوہر...... کون سا مال اور اس میں کیسا تصرف......!

یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ مال مفت بھی میسر ہے اور اس میں تصرف کا حق بھی اللہ نے دے رکھا ہے۔ بس ذرا احتیاط ہی تو بتائی ہے...... کہ عورت اس مال کی امین ہے۔ لہٰذا اسے مالک کی مرضی کے خلاف نہ لٹاتی پھرے کہ اس سے باہم

بداعتمادی اور بدمزگی پیدا ہوگی۔ گھر میں جھگڑوں کا بیج بویا جائے گا۔ جس کا نتیجہ اولاد کی پرورش میں کجی کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا، اللہ اور اس کے رسول کی تمام تر ہدایات دراصل مرد وعورت دونوں کے لیے ایسی ہیں کہ جس سے گھر، انسان سازی کا کارخانہ، نہ بگڑے اور مال جو قیامِ زندگی کا بنیادی ذریعہ ہے وہ ضائع نہ ہو۔ یوں بھی بالعموم معاشرے میں عام طور پر عورت عمر میں شوہر سے چھوٹی، فہم، تجربے اور زیرکی میں کم ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت کی جانب سے بے توجہی، لاپروائی، عدم احتیاط عین متوقع ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کے اعتبار سے بھی احتیاط عورت کے ذمے لازم ہے۔ وہ تو دونوں ہاتھوں سے خرچ کر سکتی ہے۔ مرد پورا کرتا رہے۔ اس لیے شوہر کے ساتھ افہام وتفہیم کے بغیر اس سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔

ہمارے ہاں عورت میکے کے رشتوں پر خرچ کرنا چاہتی ہے۔ اکثر وہ چھپ چھپ کر خرچ کرتی ہے۔ یہ بھی دونوں کے مابین افہام وتفہیم سے ہونا چاہیے۔ یہ رشتے دونوں جانب برابر محبت اور احترام کے رشتے ہیں۔ حسب استطاعت دونوں جانب ہی فراخ دلی کا رویہ روا رکھا جانا چاہیے۔ ہمارے ہاں میکے کا تعلق یہ گردانا جاتا ہے کہ وہ ساری زندگی بیٹی اور داماد پر خرچ کرتے رہیں اور اگر بیٹی والدین بہن بھائیوں کو تحائف یا مدد دینا چاہے تو یہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ سرتا سر ہندوانہ سوچ ہے۔ اس مریضانہ سوچ کی درستی بھی ضروری ہے۔ دوسری جانب مال شوہر کا ہے، اگر وہ اس ضمن میں ناپسندیدگی رکھے تو اللہ کو اپنا حساب خود دے گا۔ عورت بہرصورت خیانت کی مرتکب نہیں ہوگی۔ وہ اپنے ذاتی مال (اگر ہو تو) سے جو مدد، احسان کرنا چاہے وہ اس کی مجاز ہے تاہم شوہر کے مال میں ہمہ پہلو احتیاط برتے گی۔ بس یہ گنتی کی چند احتیاطیں آج ہیں جن پر آخرت میں کامیابی کی بشارت ہے۔

'عورت جو کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرے.....تو وہ جنت کے دروازوں میں

سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔' (مشکوٰۃ شریف)...... یہ اتنی بڑی بشارت ہے کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ اس لیے کہ عامۃ المسلمین اپنے اعمال کی مناسبت سے ایک ایک دروازے سے داخل ہوں گے۔ نمازوں میں نمایاں مقام رکھنے والا باب الصلوٰۃ سے، روزے میں سبقت لے جانے والا باب الریان سے اور علی ہذا القیاس......لیکن عورت کے لیے جنت کے سارے دروازے حدیث میں بیان کردہ چار باتوں پر کھول دیے۔

آبگینے

کون کہتا ہے کہ اسلام، مرد کے فائق تر حقوق کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ اول تا آخر برابری سے ایک درجہ آگے بڑھ کر خواتین کی حفاظت، تکریم اور دادودہش میں شاہانہ مہربانی کا رویہ رکھتا ہے......! اس نے صنف نازک بنایا ہے تو کانچ کی طرح اس کی حفاظت اور رعایت بھی کی ہے......! سُبحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمدِهٖ سُبحَانَ اللّٰهِ العَظِيمِ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے بے اختیار ادا ہونے والے الفاظ اسلام میں عورت کے تصور کی نہایت خوب صورت تصویر کشی کرتے ہیں۔ شتر بان نے اونٹ کو تیز دوڑایا جس پر خواتین سوار تھیں تو آپؐ پکار اٹھے: آہستہ! اس پر آبگینے ہیں۔ (مسلم)

جس طرح کانچ نہایت احتیاط کے ساتھ زبردست پیکنگ میں محفوظ کر کے، باہر ڈبے پر گلاس کی علامت بنا کر لکھ دیا جاتا ہے Glass: Handle With Care شیشہ: احتیاط برتیے...... اسلام یہی احتیاط، احترام اور تقدس عورت سے وابستہ کرتا ہے۔ لیکن آج کی عورت اس تصور کو مسترد کر کے سارے حفاظتی بند توڑ کر برستے پتھروں کے میدان میں آ کھڑے ہونے کے درپے ہے! یہ بھول کر کہ۔

جا نہیں سکتا کبھی شیشے میں بال آیا ہوا!

وہ سٹین لیس سٹیل بن جانے کے درپے ہے۔ اللہ نے اس کی فطرت میں

نزاکت رکھی ہے اور اسی میں اس کا حسن پنہاں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومنہ عورت بھی محرم دائرے میں بریشم کی نرمی اور نامحرم دائرے کے لیے فولاد کی سختی لیے ہوئے ہے، اگر وہ جانے۔ جبکہ مغرب کی عورت محرم دائرے سے عنقا ہے اور نامحرم دائرے میں فکر کی جولانیاں، عمل کی حیرانیاں لیے تمام تر عشوے غمزے سمیت حاضر ہے......!

ناشکری سے بچیے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لیے مزید جو تاکید فرمائی ہے یہ کہ ''تم اچھا سلوک کرنے والے شوہروں کی ناشکری سے بچو......تم عورتوں میں سے کسی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین کے گھر لمبے عرصے تک کنواری بیٹھی رہتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے شوہر دیتا ہے اور اس سے اولاد ہوتی ہے۔ پھر کسی بات پر ناراض ہو جاتی ہے اور شوہر سے یوں کہتی ہے...... 'مجھے تجھ سے کبھی آرام نہ ملا۔ تو نے میرے ساتھ کوئی احسان نہ کیا۔' (الادب المفرد)

یہ بات ضرب المثل کی حد تک سچی ہے کہ عورت واقعتاً اس بے قدری کی مرتکب ہوتی ہے۔ ناشکری یوں بھی ناپسندیدہ ہے اور جب یہ محبوب ترین رشتے کے لیے ہو تو تاریک تر ہے۔ آج کا دور حقوق زدگی کا دور سرتا سر ناشکری کی باضابطہ تعلیم و تربیت پر مبنی ہے۔ حقوق کی پوری فہرست ہاتھ میں لیے...... **هَلْ مِنْ مَّزِيْد** کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ ایک دوسرے میں ناشکری کے بیج بوتے ہیں اور پھر دکھ کی فصل کاٹتے ہیں۔ عورت کو اس کی سہیلیاں اور قریبی عزیز ناشکری اور 'تمھارے پاس یہ بھی نہیں' سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ جس سے گھر زہر سے بھر جاتے ہیں۔ اور جب فضا دھماکہ خیز ہو جاتی ہے تو مشیر غائب ہو جاتے ہیں اور اکیلی جان کو سب دُکھ سہنا پڑتے ہیں۔ لہٰذا گھر اور خاندان کا سکون شکر گزاری سے وابستہ ہے۔ پھر یہ بھی کہ ناشکری ماں کے بچے کبھی شکر گزار نہیں ہو سکتے۔ بچے والدین سے صرف رنگ و روپ، ناک

نقشہ نہیں لیتے خاموشی سے عادات بھی اپنے اندر اتار لیتے ہیں۔ پھر یہ تو اتنی ناپسندیدہ عادت ہے کہ تنبیہ شدید ہے: "شوہر کی ناشکر گزار بیوی کی طرف اللہ قیامت کے دن نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

آج کے دور میں جب عورت کو کمائی کے میدانِ کارزار میں اُتارا جا رہا ہے، خصوصاً وہ مرد جو بیوی کو گھر بٹھا کر کھلائے یقیناً اس لائق ہے کہ اس کا شکر گزار رہا جائے۔ گھر سے باہر کی تمام تر زندگی نہایت کٹھن اور ناگوار زندگی ہے۔ گرمی، سردی، بارش...... موسموں کی سختیاں، پرائے مردوں کی گھورتی نگاہیں، تلخ ترش گفتگوئیں، تھکاوٹ، ٹرانسپورٹ کے مسائل، غرض ان گنت ناگواریوں سے عورت کو اللہ نے بچالیا ہے۔ جو مرد اس کے لیے ڈھال بن رہا ہے اس کے حصے میں شکر گزاری آنی ہی چاہیے۔ باہر کے ماحول کی شدتیں مرد کو بسا اوقات مزید ھر درا اور کرخت بنا دیتی ہیں، اس وقتی تلخی پر صبر لازم ہے۔

مرد بھی ناشکری سے بچے

یہ نہیں کہ ناشکری صرف عورت کو منع ہے۔ مرد ڈٹ کر ناشکرا بن سکتا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ تاکید ہے کہ: "کوئی مومن شوہر اپنی مومن بیوی سے نفرت نہ کرے۔ اگر اس کی ایک عادت نہیں پسند آئی تو دوسری اور عادتیں پسند آئیں گی۔" **(مسلم)**

اگر نفرت سے منہ پھیرے گا تو بے شمار خوبیاں نگاہ سے اوجھل رہ جائیں گی۔ یہی تاکید قرآن نے بھی کی ہے: "ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔" **(النساء ۴:۱۹)**

آج ہمارے ہاں افراط و تفریط ہے۔ مرد یا تو مغرب کی تعلیم و تربیت اور

حقوق کے غلغلے سے سہا ہوا عورت کا پرس اٹھا کر مجبور ملازم کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس کی حکم عدولی سے سہا، ڈرا، دبلا ہوا جاتا ہے اور یا وہ روایتی، رعب داب، جھاڑ جھپٹ اور مہربانی سے ناآشنا مرد ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

مومن مرد کے شایانِ شان یہ رویہ نہیں ہے بلکہ عبداللہ ابن عباسؓ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ''مردوں کو ایک درجہ (زیادہ) حاصل ہے۔'' (البقرۃ ۲:۲۲۸) کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ''مردوں کو بڑا درجہ عطا کیا ہے لہٰذا ان کو تحمل سے زیادہ کام لینا چاہیے۔ عورت سے ان کے حق میں کوتاہی ہو تو برداشت کریں، یہ ان کا درجہ ہے۔''

ہمارے ہاں بڑے درجے اور مردانگی سے مراد زور، زبردستی لی جاتی ہے۔ تحمل اور برداشت تمام تر زنانہ اوصاف گردانے جاتے ہیں کہ جن کا مرد سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ چھوٹی سی چیز کھو جانے پر ہنگامہ کھڑا کر دے، غل غپاڑہ، ڈانٹ ڈپٹ کرے، کہ یہ مردانہ اوصاف ہیں۔ صبر اور تحمل عورت کی ذمہ داری ہے۔ یہ ایک تصور باطل ہے، اسے درست ہونا چاہیے۔ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا (النحل ۱۶:۸۰)۔ گھروں کو جائے سکون بنانے میں مرد کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا عورت کا۔ یوں بھی عورت بے چاری تو 'سو سنار کی اور ایک لوہار کی' کے مصداق ہوتی ہے! مرد گھر میں داخل ہو تو بھونچال آ جائے، بچے عافیت کے کونے تلاش کریں، عورت سہمی کھڑی ہو، ایسا دہشت کدہ جائے سکون تو نہ ہوئی۔ ہر وقت کے زلزلے پوری عمارت، انسان سازی کے اس پورے کارخانے کو لرزا کر رکھ دیتے ہیں۔ در و دیوار میں دراڑیں اور شگاف پڑنے لگتے ہیں ناسمجھ والد گرامی یہ بھول جاتے ہیں کہ درحقیقت در و دیوار سے پیشتر یہ دراڑیں انسانی شخصیت پر اور پروان چڑھنے والے بچوں پر پڑتی ہیں۔

اسلام کا مطلوب گھر

گھر وہ مقام ہے جو دنیا کی جدوجہد میں ٹوٹ پڑنے والی کمر توڑ...... ذہنی، نفسیاتی، جسمانی اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح:۳) تھکاوٹ دور کرنے کے لیے، مقامِ راحت وسکون ہو۔ مرد اور عورت مل کر وہ گھر تشکیل دیں جس کی پاکیزہ فضا میں محبت، رحمت، مؤدت، گھلی ہوئی ہو۔ انسان اس میں آ کر ہلکا پھلکا ہو جائے۔ زندگی کوئی توانائی مل جائے۔ کارگہِ حیات کی آزمائشوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تازہ دم کر دے۔ یہی گھر اسلام کا مطلوب ومقصود گھر ہے، جسے گھر بنانے میں مرد وعورت دونوں کی ذمہ داری یکساں ہے۔ اس کے سکون وعافیت کو درہم برہم کرنا نہ مرد کے لیے پسندیدہ ہے اور نہ عورت کے لیے۔ جو کارخانہ ہر وقت جھگڑے، فساد، افراتفری، اکھاڑ پچھاڑ، تو تو میں میں کا شکار رہے، اس میں کوئی بڑا تعمیری اور تربیتی کام ممکن نہیں۔ اس سے نکلنے والے دنیا میں کوئی کارنامہ سرانجام دینے کے لائق نہیں رہتے۔ وہ گھر سے ہی لڑ بھڑ کر قوتیں شل کر کے اور کڑوا کے نکلیں گے تو الجھے بکھرے ذہن کے ساتھ باہر بھی فساد ہی برپا کریں گے اور معاشرے کی فضا کو دھواں دھواں ہی کریں گے۔

اسی لیے گھر کا نظم قائم کر دیا گیا۔ عورت کو اس کا پابند بنا دیا۔ مرد کو اخلاق، مروت، رواداری کی تعلیم دے دی، تاکہ اس چاردیواری میں سکون پنپ سکے۔

بہترین مرد کون؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشان دہی فرمادی: ''تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے حق میں سب سے

بہتر ہوں۔'' آپؐ نے بہترین نمونۂ عمل سامنے رکھ دیا۔ جس کی گواہی حضرت عائشہؓ نے دی۔ کان خلقه قرآن۔ ''آپؐ کے اخلاق عین قرآن تھے۔'' گھر کی فضا کو آپؐ نے نرمی، محبت، شفقت، کمال مہربانی سے بھر کے دکھا دیا۔ کبھی ڈانٹا ڈپٹا نہیں، کبھی مارا پیٹا نہیں۔ یہ تک نہ کہا کہ یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا۔ (رواہ انسؓ) حالانکہ آپؐ سے زیادہ آزمائشوں کی شدت اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے پِسا ہوا اور کوئی نہ تھا۔ لیکن اس نے آپؐ کے اخلاق کو ذرہ بھر بھی میلا نہ کیا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اخلاق کے مظاہرے کا مقام گھر نہیں سمجھا جاتا۔ اخلاق اور شائستگی گھر سے باہر چھوڑ کر آنے والی چیز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باطل تصور کو درست فرما دیا کہ بہتر وہ ہے کہ جو گھر کے اندر اخلاق برتتا ہے۔

مرد بھی جواب دہ ہے

پھر یہ بھی کہ سارے گناہ عورت کے کھاتے میں نہیں ہیں۔ کیونکہ عموماً تعلیم و تربیت کا سارا زور عورت ہی پر ٹوٹتا ہے۔ شوہر کے حقوق کی آخری درجے کی یاد دہانی کی تکرار کے ساتھ عذاب کی وعیدیں ہر وقت ساتھ نتھی رہتی ہیں۔ یہ مغرب کی افراط کے بعد مشرق کی تفریط ہے۔ اور 'اَلْخَيْرُ بَيْنَ الشَّرَّيْنِ اَلْاَفْرَاطُ وَالتَّفْرِيْط' (حضرت علیؓ) 'خیر ہمیشہ دو شرور...... افراط و تفریط کے درمیان ہوتی ہے۔' ہمارے ہاں عورت کے حقوق کا غلغلہ دراصل صدیوں پر محیط مرد کے حقوق کے زبردست پرچار کا ردِ عمل ہے۔ یعنی ایک انتہا کے بعد دوسری انتہا۔ جبکہ تنبیہات (Warnings) مرد کے لیے بھی برابر موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فرمان کے مطابق: ''جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات رہے ہم عورتوں سے ڈر کر احتیاط کا معاملہ روا رکھتے تھے۔ مبادا اللہ کی طرف سے کوئی نیا حکم اور گرفت نہ آ جائے۔ آپؐ کے وصال کے بعد ہم نے عورتوں کے ساتھ کھل کر رہنا بسنا شروع کیا۔' (بخاری) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی میں

خواتین کو ایک ایسا پشت پناہ اور خیر خواہ میسر آ گیا کہ جس کی ہیبت صحابہؓ پر اس حوالے سے رہتی تھی کہ اللہ گرفت نہ کرلے اور نبیؐ کریم ٹوک نہ دیں۔

وصیت، تاکید، وعید

آپ کی آخری وصیتوں میں سے بھی خواتین کے لیے مردوں کو تاکید ہے۔ فرمایا:

''لوگو! سنو...... عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا اس لیے کہ وہ تمھارے پاس بہ منزلہ قیدی کے ہیں۔'' (ترمذی) مزید یہ کہ: ''اے میرے اللہ! میں دو قسم کے لوگوں کے حق کو محترم قرار دیتا ہوں۔ یعنی یتیم اور بیوی کے حق کو۔'' (نسائی) یعنی وہ تمھاری دستِ نگر ہے۔ تم ہی پر ان کا تکیہ اور دار و مدار ہے۔ اسی لیے تاکید، وعید اور بشارت تینوں سے اس ضمن میں آپؐ نے کام لیا۔ اس تاکید کے بعد وعید بھی...... ''آدمی کو گناہ گار کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کر دے جن کو وہ کھلاتا ہے۔'' یعنی جن کے لیے زندگی کی ساری دوڑ دھوپ کرتا ہے اور محنت کر کے انھیں کھلاتا، پلاتا ہے۔ لیکن اس کے اخلاق اور رویوں کی بنا پر وہ ضائع ہو جائیں۔ وہ کام کے انسان نہ بن سکیں۔ اس ضمن میں خواہ وہ اولاد ہو یا بیوی۔ مقصود صرف ان کے لیے کما کر لا کر پیسہ ہاتھ پر دھر دینا اور اس کے بعد بری الذمہ ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ ان کی حقیقی خیر خواہی، ان کی اچھی تعلیم و تربیت اور انھیں اچھا انسان بنانا ہے۔ اس ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے ازواجِ مطہرات میں صرف محبت نہیں بانٹی۔ تعلیم و تربیت بھی قدم قدم پر کی، بلکہ آپؐ نے جو تعلیم انھیں دی وہی انھوں نے آگے امت تک پہنچائی، پھیلائی۔ اسی طرح بیٹیوں، بالخصوص سیدہ فاطمہؓ کی تربیت میں للّٰہیت اور آخرت طلبی اس عظیم باپؐ ہی کی تعلیمات کی ودیعت تھی جو ہم نے ان کی شخصیت میں پائی۔

صدقہ ضائع نہ کیجیے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی: ''جب آدمی اپنے گھر والوں پر

آخرت میں اجر پانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بنتا ہے۔'' (متفق علیہ) یعنی گھر والوں پر خرچ کرنے میں بے زاری، بوجھ یا احسان کا رویہ نہ در آئے۔

اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی: ''اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر ضائع نہ کر دو۔'' یہ خرچ تو صدقے کا اجر لیے ہوئے ہے لیکن اس صدقے کے ساتھ مزید یہ کہ: ''باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دیتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اس کی اچھی تعلیم و تربیت ہے۔'' (مشکوٰۃ) یعنی اولاد کو دنیا اور اس کے لوازم دے دلا کر فارغ نہ ہو جاؤ، کافی نہ جانو۔ اس سے بڑھ کر اہم تر تعلیم و تربیت ہے جو تمھارے لیے صدقۂ جاریہ بنے گی۔ بیٹیاں جنت کی آگ سے نجات ہیں اور نیک بیٹے جنت کا سامان ہیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس سے اس دور میں بالخصوص غفلت برتی جا رہی ہے۔ والدین صرف ضروریاتِ زندگی رمال کی فراہمی ہی میں بے حال بلکہ ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ تربیت کا کام ٹیلی ویژن کے بھانڈوں اور گویّوں کے سر ہے یا پھر اسکول، کالجوں کے ذمے ہے۔ اولاد کی تربیت کے لیے وقت نہ والدین کے پاس ہے اور نہ اولاد کے پاس۔

وہ دن نہ بھولیے

مرد اور عورت...... دونوں کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے نگاہ آخرت پر رکھنی ہے۔ باہم تعلق میں...... گھر چلانے میں اس دن کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے، جس کی تکرار روزانہ سورۃ الفاتحہ میں 'یوم الدین' کہہ کر بار بار خبردار کرتی ہے...... معاملہ کڑا ہے، منزلیں کٹھن ہیں، سفر تنہا ہے اور جس انجام سے بچنا ہے وہ یہ ہے: وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ ○ تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ ○ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْكَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُ۔ ''کتنے چہرے ایسے کہ گرد پڑی ہو گی۔ سیاہی چڑھی ہوگی۔ یہی لوگ ناشکرے اور بدکار ہیں۔'' (سورہ عبس)

ناشکری کے ساتھ اسلام سے منہ پھیر کر بگٹٹ زندگی گزارتے، باہم حقوق کی چھینا جھپٹی میں یہ دن بھول ہی جاتا ہے، جب سب جھگڑوں کا فیصلہ چکایا جائے گا اور

حساب ٹھیک ٹھیک کر دیا جائے گا۔ اسی کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ: ''جنتی عورت کے سر کی اوڑھنی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔'' (بخاری)

مگر کیا کیجیے کہ آج عورت اوڑھنی ہی سے باغی ہے۔ سر پر اوڑھنی کا تصور تو بالکل ہی عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن جہاں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت اور اوڑھنی کا چولی دامن کا ساتھ ہے...... اور اوڑھنی، سر ہی پر اوڑھنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس چند روزہ زندگی کی قربانی اور امتحان کے بعد دائمی زندگی کے انعامات ایسے ہیں کہ اس کی چھوٹی سی چیز بھی اتنی بیش قیمت ہے کہ پوری دنیا...... اور جو کچھ اس میں ہے...... یہ اوڑھنی اس سے فزوں تر ہے......!

کیا کریں؟

بار بار اس یاددہانی کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آخرت مرد و عورت دونوں ہی کو دیکھ کر رہنی ہے۔ بجائے اس کے کہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی آخرت تباہ کرنے پر تل جائیں یہ دونوں اپنی اور پھر ایک دوسرے کی آخرت سنوارنے والے بنیں۔ جیسے نادان بچے لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کی کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ پرچہ امتحان چھین کر پھاڑ دیں۔ دونوں ہی استاد سے مار کھا کر کمرۂ امتحان سے نکال باہر کیے جائیں، سزا کے مستوجب گردانے جائیں۔ آج عملاً مرد و زن کو ایسے ہی تصادم اور کشمکش پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ کیا اس المیے کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس عقل و دانش نہیں؟

تقسیم کار

اللہ تعالیٰ نے اس تقسیم کو ہماری صواب دید پر نہیں چھوڑا، بلکہ ہمارے خالق اور رب ہونے کی حیثیت سے یہ کام خود سر انجام دے دیا ہے۔ اس تقسیم کار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جدا جدا اوصاف دیے ہیں۔ مرد کو اس کی ذمہ داری کی مناسبت سے اور عورت کو اس کی ذمہ داری کی مناسبت سے۔ جس طرح دنیا میں بھی آپ کسی

کے سپرد کام کرتے ہیں تو اس کے لیے اسے مناسب اوزار، ضروریات، کام کا ماحول فراہم کرتے ہیں۔ بجلی کا کام کرنے والا ضرورت کے مطابق تمام تر اشیا ہمراہ لاتا ہے، اسے فراہم کی جاتی ہیں۔ پھر ننگی تاروں پر کام کرنے سے پہلے مین سوئچ آف کر دیا جاتا ہے۔ وگرنہ بے چارہ وہیں جل مرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کام تفویض کرتے ہوئے، ذمہ داری کی مناسبت سے مرد اور عورت کو مختلف جسمانی ساخت (Biology) عطا کی۔ علیحدہ خصوصیات، علیحدہ نفسیاتی اور مطلوبہ جذباتی کیفیات سے نوازا۔ اور موزوں ماحول کی فراہمی ہماری ذمہ داری ٹھہرائی۔ اس تقسیم کار کے مطابق اللہ تعالیٰ نے عورت کو بچے کی پیدائش، نشوونما اور تربیت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اور مرد پر بچے کے تمام تر مصارف و اخراجات، حفاظت و نگرانی کا بوجھ ڈالا۔ دنیا لاکھ ترقی کر جائے لیکن مرد، بچے کی پیدائش پر قادر اور اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سائنس ہزار عجوبے وجود میں لے آئے لیکن یہ عجوبہ چاہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ صرف ایک ڈبے یا کٹھالی میں بچے کی پیدائش کے عوامل بنا دینے کی بات نہیں ہے۔ اس کے پیچھے وہ ایک مکمل شخصیت اپنے تمام تر قوی جذبات و احساسات کی بنیاد پر موجود ہوتی ہے جسے 'ماں' کہتے ہیں۔ مرد 'ماں' نہیں بن سکتا۔ نہ کبھی بننا چاہے گا نہ کبھی اپنے اندر یہ ہمت پائے گا...... انھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

لہٰذا صنفی کش مکش یا جھگڑے اور تکرار (Gender Warfare) دراصل خود اپنی ذات سے بغاوت ہے، اپنے آپ سے نفرت ہے۔ فطرتِ انسانی سے انکار ہے!

ماں

معاشرے میں عورت کا اہم ترین کردار ماں کی حیثیت سے ہے۔ اور یہ مقام سب سے محترم، معزز اور مقدس ہے۔ اولاد کے پیدا ہوتے ہی نوجوان، الہڑ، بے پروا سی لڑکی 'ماں' بن جاتی ہے اور کھلنڈرا، بے توجہ سا لڑکا 'باپ' کہلاتا ہے۔ اس نئی صورتِ حال میں 'پرورش اولاد' میں دو ذمہ داریاں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) بچے کی پالنے پوسنے، نشوونما کی ذمہ داری (۲) بچے کے اخراجات کی کفالت

مرد

اللہ تعالیٰ نے مرد کو کفالت اور حفاظت ونگرانی کی ذمہ داری کی مناسبت سے باہر کی کٹھن مشکل زندگی کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ لہٰذا اسے مضبوط جسم، قوی اعصاب، مضبوط پٹھے، شدت، تحکم، مضبوط ارادہ، ٹھنڈا دل و دماغ عطا کیا ہے۔ مرد پر عقل غالب ہے بمقابلہ جذبات کے۔ دنیا میں مردوں کی غالب اکثریت درجِ بالا اوصاف کی حامل ہوتی ہے۔ استثنا بہرصورت موجود رہتی ہے۔ (ایسی استثناؤں کو اللہ تعالیٰ جوڑے بنا کر درست کر دیتا ہے۔ مثلاً مردانہ استثنا کا جوڑ زنانہ استثنا سے ملا ہوا پائیں گے۔ جس میں ایک کمزور جذباتی مرد اور ایک قوی عاقل خاتون کا ازدواجی بندھن ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر دیتا ہے!)

عورت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تخلیق اور ربوبیت کا سب سے مشکل اور حساس کام عورت کے سپرد کیا ہے۔ اس کے لیے اسے مناسب اوصاف بھی دیے ہیں۔ مرد کے ذمے اسے مناسب ماحول، سکون وراحت فراہم کرنا لگا دیا۔ اور پھر عورت کو اس عظیم الشان خدمت پر مشاہرہ بھی بلندتر دیا ہے۔ (قدموں تلے جنت)۔ اسے وی آئی پی (نہایت اہم شخصیت) بنا کر عزت، احترام، تقدس کا ہالہ بھی عطا کیا۔ اس روپ میں عورت کے مقابل آنا ممکن ہی نہیں ...... اس کی برابری ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عورت ...... نبی نہیں ہوتی نبی کی ماں ہوتی ہے۔ امِ موسیٰ، امِ عیسیٰ، مریمؑ، ہاجرہؑ، ام اسماعیلؑ اور سارہؑ ...... ام اسحاقؑ ہوا کرتی ہے ایک محترم، مقدس، لائق تکریم ہستی ......!

اللہ تعالیٰ نے عورت کو اس کی ذمہ داری کی مناسبت سے حساس دل، تندیٔ جذبات، نرم ونازک جسم، ایک کلیتہً مختلف اندرونی ساخت سے نوازا ہے۔ اس

کے دل، دماغ، پٹھے، اعصاب، ہارمون، غدود سبھی اس ذمہ داری کے لیے اسے موزوں ترین شخصیت بنا دیتے ہیں۔ **لا تبدیل لخلق اللّٰہ**۔ اس فطری ساخت میں ردوبدل ممکن نہیں۔ کرو گے تو خوار ہو جاؤ گے (ایک بچے کی مانند جو اپنے تجسس اور مہم جوئی میں آ کر بیش قیمت کھلونے کے سارے کل پرزے کھول ڈالتا ہے کہ میں خود جوڑوں گا اور پھر سر پیٹ کر رہ جاتا ہے کہ وہ اپنی محبوب ترین چیز سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے)۔

عورت کو اللہ تعالیٰ نے صبر و تحمل، ایثار و قربانی، محنت و جاں سوزی، محبت و جاں نثاری اور بچوں سے بے مثل انسیت دی ہے۔

عورت کی گواہی

اس دور میں عورت کے حوالے سے جو واویلے کیے گئے انھی میں سے ایک عورت کی گواہی کا مسئلہ ہے، جسے الجھایا گیا۔ مسلمان عورت کو اکسایا گیا۔ گواہی پر لڑایا گیا۔ حالانکہ پہلے تو یہ دیکھیے مانگا کیا جا رہا ہے۔

گواہی کوئی ثانی نہیں ہے کہ مرد کو پوری دی، عورت کو آدھی کیوں؟۔ گواہی حق نہیں بھاری ذمہ داری ہے، جس کی بنیاد پر کسی انسان کو سزا دی جا سکتی ہے۔ جس گواہی کے لیے مغرب کی بہکائی ہوئی مسلمان عورت لڑ رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی کو پھانسی لگ سکتی ہے اور کوئی عمر قید پر جیل بھیجا جا سکتا ہے۔ دنیا بھر کی عورتوں کی بھاری اکثریت حساس، نرم دل، ممتا کی ماری ہوتی ہے۔ عورت کے ہاتھوں تو غلطی سے بلی بھی مر جائے تو مارے غم کے دو دن سو نہ سکے۔ اپنے ہی بچوں کی پٹائی کر کے غم ناک بیٹھ رہتی ہے۔ اور کہاں اس کی گواہی کی بدولت کوئی پھانسی پر لٹکا دیا جائے، یا جیل کی نذر ہو جائے۔ قوانین اکثریت کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں۔ خواتین کی اکثریت "مومنات غافلات" کی تعریف پر پوری اترتی ہے۔ بھولی بھالی، حساس، حیادار، دنیا کی تیزی طرّاری اور پیچیدہ معاملات سے نابلد۔ جلوس نکالنے، تقاریر کرنے، مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بحث مباحثہ کرنے

والی عورت کا تناسب الحمدللہ اس گئے گزرے دور میں بھی اقلیت ہی میں ہے۔

عورت کا گواہی دینے کے لیے جانا کسی تفریح گاہ یا پکنک پر جانے والی بات نہیں ہے۔ اسے عدالت میں جانا پڑے گا۔ عدالت جہاں ملزموں، مجرموں کا اکٹھ، مردوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ جہاں جرائم پیشہ افراد بھی موجود رہتے ہیں۔ پولیس اسلحے سنبھالے چوکس کھڑی ہوتی ہے۔ عدالتوں کے احاطوں میں آتے جاتے بسا اوقات قتل کی وارداتیں، دشمنیوں کے انتقام بھی لے لیے جاتے ہیں۔ اس ماحول میں سیدھی سادی بھولی بھالی عورت کو بے جا کھڑا کرنا، نہ تو حق ہے اور نہ تفریح، ایک زبردست ناگوار بوجھ ہے۔ جس میں اس کی ٹانگیں کانپیں گی، زبان لڑکھڑائے گی۔ تجربہ شاہد ہے کہ حیادار عورت کو خواتین کے مجمع میں کھڑا کر کے سوال جواب کے مرحلے سے گزارا گیا تو اپنا نام بھی مارے گھبراہٹ کے بھول گئی۔ یہ نارمل عورت کا ردِعمل ہے۔ کجا یہ کہ ایسے جرائم آلودہ، الزام در الزام اور بحث مباحثہ کے دوبدو معصوم عورت کو لے جا کھڑا کیا جائے۔

یہ اللہ کی طرف سے عورت کی زبردست حمایت، رحمت، تحفظ دینے کا رویہ ہے جو اسے گواہیوں میں گھسیٹ لے جانے کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ یہ تخفیف اور رعایت ہے۔ عورت پر اللہ کی مہربانی ہے۔ جس طرح موجودہ نظام میں صدر اور وزیراعظم و دیگر اہم شخصیتوں کو عدالت میں گھسیٹے جانے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ حکومت کا نمایندہ ان کی وکالت اٹارنی جنرل کی حیثیت سے کر رہا ہوتا ہے۔ بلا مبالغہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے ہر قدم پر وی آئی پی، نہایت اہم شخصیت کا پروٹوکول دیا ہے اور اسے جا و بے جا گھسیٹے جانے کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ انھی اہم شخصیات کی طرح اسے تنہا نکلنے سے منع فرمایا۔ صدر، وزیراعظم نکلتے ہیں تو پورا ہٹو بچو کا اہتمام ہمراہ ہوتا ہے۔ آپ صدر کو اتوار بازار میں ٹماٹر پیاز کی ریڑھی پر کھڑا نہیں پاتے۔ بالکل یہی معاملہ عورت، اس کے وقار، تقدس اور معاشرتی حیثیت کا اسلام میں ہے۔ وہ نہایت بیش قیمت اور ذی وقار ہے، لہٰذا اس

کا پبلک مقامات پر جانا، موجود رہنا اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔

یہ تو مغربی عورت اور اس کی مقلد مشرقی عورت کی نگاہ کی خرابی ہے کہ وہ دیکھنے اور سمجھنے ہی سے قاصر ہے، کہ جسے آزادی کی نیلم پری سمجھ کر وہ بلک رہی ہے اس طرزِ حیات میں اس کی بربادی ہے۔ عورت، اللہ کی شکرگزار ہے کہ اس نے اسے عدالت کے جھگڑے رگڑے سے بچایا۔ مسئلہ آدھی پوری گواہی کا نہیں ہے۔ گواہی اور عدالت، ناگزیر حالات میں عورت کو بلاتے ہیں۔ وگرنہ یہ اس کے شایانِ شان ہی نہیں ہے۔ لہٰذا حوصلہ شکنی کے لیے بصد مجبوری اگر اسے گواہی کے لیے بلانا پڑے تو حکم یہ ہے: ''اور گواہی حاصل کروا اپنے مردوں میں سے دو کی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم بہ حیثیت گواہ پسند کرتے ہو۔ (ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لیے کہ) اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔'' (سورۃ البقرہ ۲:۲۸۲)

دو عورتیں کیوں؟

پہلی وجہ تو یہی جو بیان کردہ ہے ...... ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ انسان کی طبیعت میں نسیان (بھول) ہے۔ حضرت آدمؑ وحوا کی کہانی بھول ہی سے شروع ہوتی ہے۔ عورت میں بھول زیادہ ہے۔ وہ گھرداری، بچوں کی نازک ترین ذمہ داری میں گھری ہوتی ہے (دنیا کی عظیم اکثریت) باہر کی دنیا ...... مال، پیسوں، کاروبار کی دنیا، جرم وسزا کے واقعات ان سے اس کا براہِ راست واسطہ نہیں پڑتا (مثال ...... دنیا بھر کی سٹاک مارکیٹیں، بشمول امریکہ، جاپان کلیتاً مردوں کے ہاتھ میں ہیں) لہٰذا، ایسے تمام معاملات میں گواہی میں سٹ پٹانا، بھول جانا، عورت کی فطرت ہے۔ (وہ بے چاری تو بازار کے سودوں کی فہرست میں بھی ہمیشہ اہم ترین چیز ہی لکھنا بھول جایا کرتی ہے اور دوبارہ سہ بارہ بچے کو دوڑاتی ہے کہ جاؤ فلاں چیز تو رہ ہی گئی

لے آ ؤ!) لہٰذا یہ اس کی فطری کمزوری ہے جسے باعث عار سمجھ کر غیرت کھانے اور جلوس نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی یہ کمزوری اس کی معصومیت، نسائیت کا حسن ہے ...... اسے قائم رہنے دیجیے۔ اس پر تیزی، طراری کا غازہ تھوپنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عورت جس کے خلاف گواہی دے گی، اس فریق کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے گی۔ لہٰذا دوسری عورت اس کی مددگار اور سہارا بنے۔ ذمہ داری کا بوجھ بانٹے۔ عورت عادتاً بھی (اگر وہ نارمل حیادار عورت ہو تو) تنہا کہیں جانے سے گریزاں ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسی جگہ جہاں معاملہ اتنا کٹھن ہو! خالق سے بہتر اس کی ضرورت، نفسیات کو جاننے والا اور کون ہوگا: اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ، ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟'' یوں بھی اسلامی طرزِ حیات وقوانین پر ہمارے اعتماد کی بنیاد یہ ہے: وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' اپنے علم کی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے ہم قانونِ الٰہی کا دامن تھام لیتے ہیں کہ اسی میں ہماری عافیت پنہاں ہے۔ قانونِ شہادت اپنی جگہ ایک الگ موضوع، نازک اور پیچیدہ مباحث لیے ہوئے ہے۔ ہمارا مقصود صرف شک اور بداعتمادی کے اس کانٹے کو نکالنا ہے جو مغرب زدگی کے مارے ہوئے لوگوں نے چبھو رکھے ہیں۔ یہ کسی طور بھی عورت کی تحقیر یا اہانت نہیں ہے جسے گواہیاں دینے کا شوق مارے ڈالتا ہو وہ یہ جان لے کہ ولادت، رضاعت، بکارت، ایام کے میدانوں میں اسے گواہی کی جولانیاں دکھانے کی اجازت تنہا دی گئی ہے۔ زنا بالجبر میں بھی تنہا مدعیہ کی شہادت کافی ہے۔ (ابی داؤد)

مردانہ حاکمیت (Male Chauvinism) جیسی اصطلاح مغرب میں ''تحریکِ آزادیٔ نسواں'' کی تخلیق ہے۔ جس میں مرد سے مارے حسد کے لڑنے گھلنے مرنے کے لیے اسے طعنہ دیا جاتا ہے کہ ہر قدم پر مرد تکبر ونخوت میں مبتلا ہو کر عورت کی تحقیر کرتا ہے۔ حالانکہ یہ عورت خود بلا سبب اس بخار میں مبتلا ہے۔ اس نے اپنی دیوانی

میں ''مرد'' کو عزت و شرف اور سربلندی کی کسوٹی بنایا ہے اور اسے پانے کے لیے ست پٹا، ست پٹا کر دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ سارے مسئلے کا آسان حل یہ ہے کہ وہ اس خود ساختہ معیار کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے عورت ہونے پر شاداں، فرحاں، نازاں ہو جائے۔ نہ اسے مسلز (پٹھے) بنانے کی ضرورت ہے اور نہ دکھانے کی۔ نہ مردانہ پینٹ کوٹ پہن کر اس کے مقابل کھڑا ہونے کی۔ نہ سارے حوصلے بمشکل تمام جمع کر کے، مردانگی کے گھونٹ پی کر جہاز اڑانے، سطح سمندر پر سرفنگ (پھسلنا) کرنے کی ضرورت ہے۔ سکون کے دائرے میں رہ کر، عافیت اور وقار کی اس زندگی پر مطمئن ہو رہے جو مالک نے اس کے لیے تجویز کی ہے۔

عورت اور طلاق کا حق

آج کے اس ستم رسیدہ دور میں ہر چیز ''حق'' کہلانے لگی۔ پہاڑ سی بوجھل ذمہ داریوں کو ''حق'' کا نام دے دیا گیا۔ اور جیسے نادان بچہ رو رو کر چمکتی دمکتی تیز دھار چھری کا طلب گار ہوتا ہے، اسی طرح آج کی دیوانی عورت چھریوں کی مالا اپنے گلے میں ڈالنا چاہ رہی ہے۔ اسے مانگنا سکھایا جا رہا ہے۔ طلاق، فی نفسہٖ حلال کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام ہے۔ جس کا دروازہ بہ کراہت (ایمرجنسی) ہنگامی حالت میں کھولا جاتا ہے۔ طلاق جائز سہی لیکن ابنارمل اور ناپسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقدۃ النکاح (نکاح کی گرہ) مرد کے ہاتھ میں تھمائی ہے۔ عورت اگر شوہر سے علیحدگی چاہے تو وہ خلع کے ذریعے اسے حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن طلاق دے دینے کا حق عورت کے پاس نہیں ہے۔ تاہم قانونِ شریعت میں فیملی لا آرڈی نینس (۱۹۶۱ء) کے تحت بہت سی غیر شرعی ترمیمات کی گئیں۔ مغربی قوانین سے متاثر ہو کر الٰہی قوانین کو بدلا گیا۔ گویا بہت سی تبدیلیاں بہ زبانِ حال یہ کہہ کر کی گئیں کہ اللہ کے بنائے قوانین کی کمزوریاں، کمیاں (معاذ اللہ) ہم دور کر رہے ہیں۔ اسی مریضانہ فکر کے نتیجے میں

تفویضِ طلاق کو بطورِ شرط مستقلاً نکاح نامے میں داخل کیا گیا۔ عورت کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طلاق کا حق اپنے لیے لکھوا لے۔ یوں عورت بھی کھڑے کھڑے شوہر کو طلاق دے کر فارغ کر سکتی ہے۔

طلاق کا ''حق'' لینا عورت کے لیے گویا گولیوں سے بھری پستول ہمراہ لیے پھرنا ہے۔ یہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ اللہ نے مرد کو مضبوط اعصاب اور ٹھنڈے دل و دماغ سے نوازا ہے۔ اس کا وجود بالعموم ایک غیر جذباتی وجود ہے، جبکہ عورت جذبات میں گوندھی ہوئی ہے۔ جذبات کی شدت اور تندی اس کے دل و دماغ پر چھا کر اسے جہاں پرورش اولاد کی کٹھنائیوں سے گزرنے کے قابل بناتی ہے، وہاں یہی جذباتیت بسا اوقات عقل کو کھا جاتی ہے۔ گویا یہ جذباتیت کے اثرات مابعد (Side Affects) ہیں۔ مرد (الا ماشاء اللہ) طلاق کا حق رکھنے کے باوجود تحمل، ضبط اور برداشت سے کام لیتا ہے۔ عورت ملکۂ جذبات ہے۔ اسے یہ حق دے دیا جائے تو یہ حد درجے خطرناک ہے۔ مثلاً ...... شوہر نے بیوی سے کہا کہ وہ بارہ بجے اسے آ کر سیر کو لے جائے گا۔ وہ بارہ بجے نہ آیا، بیوی منتظر رہی، پیر پٹختی رہی، دو بج گئے، تین بج گئے، اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا اور غم و غصہ، ناراضی کی شدت اس کے حواس کو معطل کرنے لگی۔ شوہر نے فون کرنے کی بھی زحمت نہ اٹھائی۔ یہ بی بی طرح کے وسوسوں کا شکار وعدہ خلافی پر آگ بگولہ۔ شام چھ بجے شوہر اندر داخل ہوا۔ اور (پچھلے کئی مواقع کا غصہ بھی خاتون نے ادھار کر رکھا تھا) ...... دروازے ہی پر فیصلہ ہو گیا۔ شدتِ جذبات اور شدتِ غضب میں دھواں دھار ...... طلاق ...... طلاق ...... طلاق ...... کے الفاظ ادا ہوئے اور ساری ازدواجی زندگی ملیامیٹ ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھری ہوئی پستول عورت کی دسترس سے باہر رکھی تھی۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ لَا تَعْلَمُوْنَ 'وہ ہم سے جیسا واقف ہے، ہم خود بھی اپنے آپ کو ویسا نہیں جانتے۔

بے شمار مصلحتوں میں سے ایک واضح مصلحت یہی جذباتیت ہے۔ ابھی تو معاشرے میں معدودے چند جذباتی مردوں کے ہاتھوں ایسے حادثے ہوتے ہیں جن کے بعد وہ روتے پیٹتے پھرتے ہیں۔ گھر بچے رل جاتے ہیں۔ اگر عقدۃ النکاح بھی کھولنے کا حق عورت کو دے دیا جاتا تو تیزی سے بڑھتی ہوئی شرحِ طلاق کئی گنا بڑھ جاتی۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے دنیا کی بربادی اور آخرت کی جواب دہی کا یہ سامان (الا ناگزیر) عورت کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ مرد اگر یہ فیصلہ کرے گا تو ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی نسل کی فلاح و خسران کو پیش نظر رکھ کر کرے گا۔ یہ غلط مفروضہ ہے کہ طلاق سے مرد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مرد کے لیے اخلاقی، مالی، نفسیاتی بحران عورت سے بھی شدید تر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ شادی اسلامی ہو اور آخرت کی جواب دہی کی فکر ہمراہ ہو۔ نیز وہ حیادار بھی ہو۔

عورت اور تعدّد ازواج

یہ موضوع بھی وہ ہے جو اس دور میں بہت زیادہ رگیدا گیا ہے۔ انگریز اور ہندو کی دُہری غلامی اور ان کے تمدنی و ثقافتی اثرات نے اسے باضابطہ گناہ کا درجہ دے ڈالا ہے اور چونکہ عورت کی بھی یہ دُکھتی رگ ہے۔ اس کی طبیعت میں مصلحتاً رکھی گئی حاسدانہ کیفیت (مرد کے اخلاقی تحفظ کے لیے) اس مسئلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بچار، گفتگو حتیٰ کہ تحریر کی بھی متحمل نہیں ہو پاتی۔ جذبات کے غُل غپاڑے میں یہ مسئلہ لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں بھی عموماً ابتدا ہی معذرت خواہانہ اور مدافعانہ دلائل سے ہوتی ہے۔ اِس کی مصلحتیں سمجھا سمجھا کر مخاطب/معترض/ ناقد کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تسلی دلانے کو پہلے ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ ہم بھی ایمان کے ہاتھوں مجبور ہیں لہٰذا صرف صفائی ہی پیش کر رہے ہیں۔ معاشرے میں اس کا رواج پاتا یا اس کی اجازت دینا ہمارا بھی مطمع نظر نہیں ہے۔

اس نازک ترین موضوع کی طرف آنے سے قبل ایمان کو از سرِ نو لا الٰہ پڑھ کر

تازہ کر لینا ضروری ہے۔ اپنی عقل اور دانش وری اٹھا کر ایک طرف رکھ دینا اور **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** ''اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے'' کا وِرد بھی لازم ہے! حضرت عائشہؓ کے حوالے سے وہ واقعہ تازہ کر لیجیے جس میں ایک خاتون آپ کے پاس آتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہم خواتین کو ایام میں چھوڑی ہوئی نمازیں لوٹانے سے رخصت دی گئی ہے جبکہ چھوٹے ہوئے روزے ہمیں دوبارہ رکھنے ہوتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ سادہ سا جواب دیتی ہیں: 'ایسا اس لیے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں روزے لوٹانے کا حکم دیا تھا اور نمازوں کے لیے یہ حکم نہیں دیا تھا۔ وہ خاتون دوبارہ پوچھتی ہے: 'لیکن اس کی وجہ کیا ہے کہ ہم روزے لوٹائیں اور نمازیں چھوڑ دیں۔' حضرت عائشہؓ کا چہرۂ مبارک غصے سے سُرخ ہو جاتا ہے کہ 'کیا تیرے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم اسی طرح فرمایا تھا؟'

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ جواب نہایت اہم ہے کہ ایمان کی اصل بنیاد پورے تیقن کے ساتھ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر یکسو ہو جانا ہے۔ سوالوں کے جواب وقت خود دیتا چلا جاتا ہے۔ حکمتیں اور اسرار کھلتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں اسلام کے حوالے سے بسا اوقات ایسے سوالات داغے جاتے ہیں جو گستاخی کی حدود کو جا چھوتے ہیں۔ یہ شاخسانہ ہے دینی، تہذیبی اقدار سے بے بہرہ نظامِ تعلیم کا۔ لہٰذا تعدد ازواج کا خارزارانہ موضوع چھیڑنے سے پہلے فکر کا زاویہ اور ذہن کا سانچا درست کرنا ضروری ہے۔ یوں بھی اس موضوع پر سنگ باری کرنے والے مغربی یا مغرب زدہ دانش ور اپنے شیشے کے گھر پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ بدقسمتی سے جس کا چربہ آج ہمارے ہاں اپنے رنگ دکھا رہا ہے۔ مغرب میں یک زوجی کے نام پر عملاً صد زوجی جاری و ساری ہے۔ بلکہ زوجیت کا جھگڑا ہی ختم کر ڈالا گیا۔ اصطلاحیں بھی بدل گئیں۔ بیوی کی جگہ ''پارٹنر'' اور ''دوست'' کا لفظ رائج ہو گیا۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہ پارٹنر ہم جنس بھی ہو سکتا ہے۔ اب یہ تہذیب واقعتاً اپنی حرکتوں کے باعث

لائق دشنام ہے۔

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس 'ترقی' زادی کا حلیہ بگاڑ دے

چنانچہ تعدِ دازدواج کا موضوع ہم اپنی نسلوں کے فہم کے لیے زیرِ گفتگو لائیں گے تاکہ اس پر سنجیدگی سے غور وفکر کیا جا سکے اور ایمان پر آنچ لائے بغیر ہم اس کے مختلف پہلو جانچ سکیں۔

بنیادی بات تو یہ ہے کہ انسان معاشرے کا ایک رُکن ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ معاشرے کی اجتماعی فلاح و بہبود پر لازماً انفرادی خوشی و ناخوشی، پسند و ناپسند کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ دنیا کی زندگی کی حیثیت امتحان کی ہے، مسافرت کی ہے۔ (دنیا میں اس طرح رہو جیسے ایک اجنبی یا مسافر) دل کی ہر خواہش، چاہت یہاں پالینا ممکن نہیں بلکہ ''اللہ نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے'' (البلد: ۴) دنیا میں دُکھ، جسمانی، روحانی صبر سے جھیلا جائے تو آخرت کا توشہ ہے۔ صبر کا بدلہ جنت ہے۔

شادی بیاہ کے تصور کو شیطان نے بُری طرح اُلجھا رکھا ہے۔ افسانے، فلمیں، ڈرامے، ناول، قصے کہانیاں، عشق عاشقی، خوابوں کی حسین دنیا۔ لیکن یہ سب شادی سے پہلے۔ یہ کہانی اسلام میں شادی کے بعد شروع ہوتی ہے باہم اعتماد، وفا شعاری، ایمان اور حقیقی جائز حلال محبت کی بنیاد پر۔ جہاں محبت عبادت کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، اور اس کی تعداد ایک تا چار ہو سکتی ہے۔ گویا پہلی تا چوتھی...... سبھی عبادت میں شمار ہوں گی، نکاح کے دائرے کے اندر! تاہم (سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ میں یہ صرف اجازت ہے، حکم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ترغیب بھی نہیں ہے۔) خواہش یا ضرورت کے تحت جب ایک سے زاید شادی کے مواقع پیش آئیں تو قرآن اس اجازت کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہم اللہ کے حرام کردہ کو حلال نہیں کر سکتے اسی طرح اس کے حلال کردہ کو حرام نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کراہت کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

انسانی تاریخ میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں جہاں کثرت ازواج خواہش سے بھی بڑھ کر ایک ناگزیر سماجی، تہذیبی اور انسانی ضرورت بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جنگوں کی صورت میں۔ جیسا کہ سورۂ نساء کے مذکورہ بالا حکم کے پس منظر میں جو حالات درپیش تھے۔ شہدا کی بیواؤں، یتیم بچیوں کی کفالت، حفاظت کے لیے اور کوئی جائز، حلال راستہ نہیں رہتا۔ معاشرے کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے لیے ایک مرد، دو، تین، چار شادیوں کے ذریعے خواتین کو معاشرے کے سرد گرم سے بچا کر فرد اور معاشرہ دونوں کو تحفظ فراہم کرے گا۔ عام حالات میں بھی مردم شماری کے اعداد وشمار گواہ ہیں کہ مردوں کی تعداد کم ہے اور خواتین کی زیادہ۔ اولاً تو طبی اعتبار سے یہ مسلم الثبوت ہے کہ پیدائش کے مراحل میں لڑکے زیادہ مرتے ہیں اور لڑکیاں زیادہ تعداد میں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر لڑکے/مرد...... باہر کی مشکل دنیا نبھاتے ہوئے حادثوں کا شکار ہوتے ہیں۔ لڑکیاں / خواتین گھروں میں محفوظ...... قرب قیامت کی علامات میں بھی یہ شامل ہے کہ مردوں کی تعداد بہت کم ہو جائے گی۔ خواتین بڑھ جائیں گی۔ 'پچاس عورتوں کا ایک نگران ہوگا۔' (بخاری)

اگرچہ ابھی مردم شماری اِس مقام کو نہیں پہنچی۔ تاہم یہ عدم توازن اب بھی ایک محسوس مشاہدہ ہے۔ چونکہ مرد کو ایک سے زاید کی ذمہ داری نبھانی پڑ سکتی ہے، اس لیے اس کی فطرت میں اس کی پیش بندی رکھی گئی ہے۔ مرد نہ صرف ایک سے زیادہ خواتین کی ذمہ داری اٹھانے کی وسعت جسمانی، نفسیاتی اعتبار سے اپنے اندر رکھتا ہے، بلکہ وہ فطرتاً ایک سے زیادہ کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ (فطرتاً polygamous ہے) یہ نظامِ فطرت ہے۔ اس لیے کہ اگر شدتِ طلب نہ ہو تو یہ ذمہ داری اتنی بھاری بھرکم ہے کہ اسے اٹھانے کا تصور بھی محال ہے۔ خصوصاً اللہ سے ڈرنے والے مرد کے لیے کہ جسے آخرت کی جواب دہی کی فکر بھی دامن گیر ہو۔ یہ دینی اور لادینی کی بحث سے قطع نظر، مرد کی کثیر الازواج (Polygamous) فطرت دنیا بھر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلام آگے

بڑھ کر اس فطرت کو لگام دیتا ہے، تحدید کرتا ہے، تہذیب سکھاتا ہے اور عدل وانصاف کی کڑی شرط عاید کرتا ہے۔ عدل نہ کرنے کی صورت میں آخرت میں آدھے مفلوج دھڑ کے ساتھ حاضری کا خوف دلاتا ہے۔ یہ سب اللہ کی عورت کے ساتھ نرمی، مہربانی اور شفقت کی بنا پر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسری کی خواہش ہے؟ اُس دوسری عورت کا حق بھی اللہ نے محفوظ کر دیا اور درحقیقت اس کے ذریعے پہلی بیوی کو بھی تحفظ دیا۔ یعنی دوسری عورت بھی بے وقعت نہیں ہے۔ عورت جنس ارزاں یا ایک صنفی کھلونا نہیں ہے کہ اس کی معیت، گفتگو، چاہت سے تم یونہی مفت میں لطف اندوز ہوتے پھرو۔ سیر سپاٹے، تحائف، ہوٹلنگ سے تم اس کی قیمت چکاتے رہو۔ عورت محترم ہے، مقدس ہے اور مال مفت نہیں۔ تمھیں پسند ہے تو نکاح کے حصار میں لاؤ۔ اس کی پوری ذمہ داری اٹھاؤ، معاشی کفالت کرو اور اس کی نسل کی مکمل ذمہ داری ادا کرو۔ یہ فریب اور ہوس میں لتھڑا عشق ومحبت کا زبانی جمع خرچ، عورت کو زندگی بھر کے لیے روگی کر دے گا اور تم روند کر چلتے بنو گے۔ اسلام کہتا ہے! خبردار، ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ بوجھ اٹھا نہیں سکتے تو ایک پر اکتفا کرو۔ یوں اللہ تعالیٰ نے صنفی بدامنی بلکہ جنسی دہشت گردی کے تمام دروازے بند کر دیے۔ آج کی یہ نام نہاد تہذیبی دنیا تو درحقیقت صنفی دہشت گردی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ جو بموں، میزائیلوں سے زیادہ تباہ کن ہے کہ یہ اخلاق وکردار کے پُرزے اڑائے دے رہی ہے۔ آج حیا باختگی اور فحاشی، مغرب کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ ۲۰۰۶ء میں اس مکروہ کاروبار کے ذریعے ۵۷ ارب ڈالر کمائے گئے جن میں سے ۱۲ ارب صرف امریکہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ وہی اس صنعت کا مرکز ہے۔ فحش ویب سائٹس ۴۲، لاکھ کی تعداد میں موجود ہیں۔ (میٹھا زہر: اوریا مقبول جان، روزنامہ نوائے وقت ۶ جون ۲۰۰۶ء) یہ ملٹی نیشنل انڈسٹری دنیا سے اقدار، اخلاق، خاندان، عورت اور اس کا احترام سبھی کے چیتھڑے اڑا رہی ہے۔ ایسے میں اسلام کو چار شادیوں کا طعنہ دینا!

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں یہ بے ننگ و نام ہے

اللہ تعالیٰ، مرد کی خواہش کو ذمہ داریوں کے خوف کی لگام دیتا ہے۔ اگر کوئی اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار ہو تو اس ضمن میں اس کی تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ دونوں، تینوں، چاروں کے مابین وقت، وسائل کی منصفانہ تقسیم کا سارا بوجھ مرد کے کاندھوں پر۔ تعدد ازدواج کی صورت میں شریعت عورت یا مرد کو یونہی نہیں چھوڑ دیتی، مکمل رہنمائی دیتی ہے۔ اسوۂ نبویؐ میں اس کا بہترین اور مکمل نمونہ موجود ہے۔ روئے زمین کی بہترین خواتین جو سیّدالبشرؐ کی زوجیت میں باہم رفیقات تھیں۔ اس میں انسانی مزاج کی پوری جھلک، چھوٹے بڑے مسائل اور نہایت عمدگی کے ساتھ ان کے حل کی تصویر سامنے آتی ہے۔ بلاشبہہ یہ کڑا امتحان ہے۔ لیکن جنت کی راہیں انھی پتھروں پہ چل کر ہموار ہوتی ہیں اور حقیقتاً یہ اتنا مشکل امتحان ہے کہ جس پر پورا اترنے کے کم ہی لوگ متحمل ہوتے ہیں۔

آج بھاری بھرکم لوازمات تعیّشات سے پُر زندگی، نہایت مہنگی تعلیم، علاج معالجے کے بے پناہ اخراجات مرد کو ایک بیوی اور دو تین بچے پالنے میں ادھ موا کر دیتے ہیں۔ ایسے میں مرد دوسری شادی کی ذمہ داریاں کیونکر اٹھائے گا۔ تاہم موجودہ حالات توجہ طلب ہیں۔ دفاتر زیادہ تر مخلوط ہو چکے ہیں۔ غیر شادی شدہ لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد تعلیم نوکریوں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں دفاتر میں کام کر رہی ہے۔ اوقاتِ کار صبح سے شام تک ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا، شام کی چائے گھر بیوی بچوں کا ساتھ بیشتر مقامات پر عنقا ہو چکا۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، استاد، پرائیویٹ جاب، ملٹی نیشنل والے سبھی کا یہ عالم ہے۔ زیادہ وقت دائیں بائیں غیر خواتین کے ساتھ گزر رہا ہے۔ نتیجہ واضح ہے۔ ایسے میں کیا رویہ بہتر ہے؟ محض دوستی...... ایک، دو، تین سے حرام میں وقت گزاری یا نکاح کے دائرے میں لا کر معاشرے اور عورت کو تحفظ فراہم کرنا؟

ان مسائل سے ہم آج صرفِ نظر کریں گے تو کل یہ کئی گنا گھمبیر ہو کر ہماری اقدار چاٹ جائیں گے۔ روشن خیالی اور بے خیالی ہی میں معاشرہ قیامت کی چال چل گیا تو عورت رُل جائے گی۔ دوسرے نکاح کا دروازہ کھلا رہنے دیجیے۔ عورت اپنے استحصال کی اجازت نہ دے۔ نکاح کے بغیر گفتگو اور صحبت (company)، کے تمام دروازے بند کردے۔ یہ واضح ہو کہ چاہت ہے تو شریعت کے دائرے میں اور خدا خوفی کے ساتھ ذمہ داری اٹھاؤ۔ پہلی بیوی اللہ کے احکام کا احترام کرے اور یہ جان لے کہ اللہ نے جس طرح ماں باپ کے دل میں دو، چار، چھ، دس اولادوں کے لیے یکساں محبت انڈیلی ہے اور ایک کے بعد دوسرے، تیسرے بچے کی پیدائش پہلے بچے کے لیے کسی کمی کا باعث نہیں بنتی۔ ہر بچہ والدین کو یکساں محبوب ہوتا ہے۔ ہاں عادات، مزاج، اخلاق کسی فرق کا باعث بنے تو بات دوسری ہے۔

تاہم یہ دیکھنا مرد کا کام ہے کہ وہ مال، وقت اور پیش آنے والے مسائل کے اعتبار سے دوسری شادی کا متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس مرحلے پر معاشرے کو ذہناً اس حوالے سے تربیت دینا اور نفسیاتی اعتبار سے تیار کرنا از حد ضروری ہے۔ عیاش، بدمعاش مغرب، کی تنقیدی بوچھاڑ کو یکسر نظر انداز کر کے اسلامی نظامِ حیات اور اس کی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرے میں بن بیاہی، مطلقہ، بیوہ کے لیے دوسری شادی کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کا تحفظ فراہم کرنے کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

جذباتی اعتبار سے عورت کے لیے یہ یقیناً بہت کڑا امتحان ہے۔ لیکن اللہ کی رضا اور آخرت کی آسانی و اجر کے لیے بہت سی مشکلات انگیز کی جاتی ہیں اور کی جانی چاہییں۔ اس میدان میں تقویٰ والے، متحمل، متوازن مزاج مرد وزن احتیاط سے قدم رکھیں اور سابقون الاوّلون کا درجہ پائیں ایک مردہ سنت کو زندہ کرنے کے اعتبار سے!

فطرت اٹل ہے

یہ فطری تقسیم کار اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت میں اس حد تک الہام کر دی ہے کہ آپ چھوٹے لڑکے اور لڑکی کو گڑیا دے دیجیے۔ تجربہ تقسیم کار واضح کر دے گا (مغرب میں اس تصور کے تحت کہ دونوں کو مساوات کی تعلیم دینی لازم ہے لہٰذا گڑیا سکولوں میں چھوٹے لڑکوں کو کھیلنے کو دی جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نتائج وہی ہوتے ہیں جو اللہ نے اس کی فطرت میں رکھے ہیں)۔ لڑکی گڑیا اٹھاتے ہی ننھی سی ماں کا روپ دھار لیتی ہے۔ بنانا، سنوارنا، پچکارنا، کھلانا، پلانا، اوڑھانا، پہنانا......! اور لڑکا ......گڑیا اٹھا کر اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق بازو، ٹانگ، گردن نکال کر بے پروائی سے ادھر ادھر پھینک کر ہنس دے گا، ننھی بہن کو چڑاتا ہوا......! وہ لطیف ملائم جذبات سے محروم ہے۔ اس کی دنیا سخت کوشی، شدت طلبی کی دنیا ہے۔ جس میں تخریب بھی ایک جزو ہے۔ زمین کا سینہ شق کرنا، چٹان توڑنا، سانپوں بھیڑیوں سے دو دو ہاتھ کرنا، بلڈنگیں، پل بنانا غرضیکہ سخت جانی، زور آزمائی، فطرت سے نبرد آزمائی اس کے حصے میں ودیعت کی گئی ہے۔ سرد گرم کے تھپیڑے، جنگلوں کی مصیبت...... یہ سب مرد کا حصہ ہے۔

عورت اپنی فطرت میں اتنی نرم طبع، رقیق القلب اور حساس ہے جذبۂ امومت، مادریت اسے اتنی فراوانی سے عطا کیا گیا ہے کہ وہ صرف اپنی اولاد کے لیے نہیں، بلی اور چڑیا کے بچے کے لیے بھی دلی حساسیت رکھتی ہے اور بلا مبالغہ ایک عورت کے اندر اللہ نے کم از کم درجن، ڈیڑھ درجن بچوں کے لیے محبت کی فراوانیاں عطا کی ہوتی ہیں۔ یہ تقسیم کار صرف انسانوں میں نہیں بلکہ یہ صنفی تفریق اور ذمہ داریوں کی

تفویض عالم حیوانات میں بھی اسی طرح ہے۔ تجربہ شاہد ہے۔ ایک چڑیا کا ننھا سا بچہ گھونسلے سے باہر بے یارومددگار گرا پڑا پایا گیا اسے گھر میں لاکر ہر چیز کھلانے کی کوشش کی گئی ...... مگر...... جس کا کام اسی کو ساجھے۔ بالآخر ایک مصنوعی گھونسلا بنا کر درخت پر بچے کو بٹھانے کی دیر تھی کہ بے قرار ماممتا اسے ڈھونڈتی آ پہنچی۔ پیچھے پیچھے بچے کا باپ بھی تھا۔ اب باپ کو بچے کی حفاظت پر مامور کر کے ماں بچے کی خوراک کی فکر میں لگ گئی۔ جس نے تھوڑی دیر میں ننھا سا کیڑا چونچ میں دبا کر پے در پے دو تین مرتبہ بچے کی خاطر تواضع کی۔ اس دوران چوکس باپ بچے کی حفاظت اور پہرے داری پر مامور رہا۔ یہ منظر اللہ کے ودیعت کردہ نظام کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، جس نے ہر نوع کی ماں میں بچے کی نشوونما اور پرورش کا جذبہ رکھا ہے اور باپ کو حفاظت و نگرانی پر مامور کیا۔

ان حقائق کی روشنی میں مرد اور عورت دونوں باہم دگر ناگزیر ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے اور نامکمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطری تقسیم کار کو قبول کر کے اس کے عطا کردہ نظامِ حیات کے مطابق کام کرنے میں فرد اور معاشرے کی فلاح ہے۔ سکون اور عافیت ہے۔ اس کے خلاف چلنا اپنے خلاف نبرد آزما ہونا ہے۔

فطرت سے نہ لڑیئے

عورت کے کام سے تحقیر وابستہ کر کے اسے گھر سے بے گھر کر دینے کا رویہ اس وقت ایک بین الاقوامی رویہ ہے جس کے تھپیڑے ہم بھی سہہ رہے ہیں۔ درحقیقت اللہ نے مرد نہیں عورت کو اس لائق گردانا کہ وہ اللہ کی صفات کی روشنی میں خلاقی اور ربوبیت کی عظیم الشان ذمہ داری ادا کرے۔ یہ عورت کی صلاحیتوں پر اعتماد کا

زبردست اظہار ہے۔ خاک سے انسان گھڑنا اور معاشرے کی گود میں لعل و گہر بھر دینا عورت کے ذمے ہے۔ جس ذمہ داری پر وہ مامور ہے وہ حد درجہ نازک اور توجہ طلب ہے۔ اگر مرغی کو بھی آپ ٹک کر انڈے نہ سینے دیں تو وہ انڈہ نہ چوزہ بنا سکے گا اور نہ ہی آملیٹ کے لائق رہے گا۔ کجا یہ کہ عورت کو اس کی ذمہ داری سے اٹھا اٹھا کر گلیوں، بازاروں، دفاتر، ہوائی جہازوں میں اڑا دینا! نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ دو تین نسلوں سے انسان نہیں بن رہے۔ اس کارخانے سے جس معیار کے انسان (Human Stuff) بن رہے ہیں وہ نہایت تشویش ناک ہے۔ نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ۔ جھاڑ جھنکار پیدا ہو رہا ہے (معذرت کے ساتھ)۔ قوموں کی قومیں قیادت کو ترس رہی ہیں۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ ستاون مسلمان ممالک میں...... انسانم آرزوست...... کی پکار لگ رہی ہے۔ چہار سو گھپ اندھیرا ہے۔ مغرب اس راستے پر چلا یہاں تک کہ اللہ نے خود ان کے ہاتھوں ان کے یہ کارخانے ہی بند کروا دیے۔ اب ان کی شرح افزائش آبادی تشویش ناک حد تک کم ہے۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت

یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اشارۃً تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ حال ہی میں یہ اعداد و شمار سامنے آئے کہ: 'دو سو سال بعد جرمن اور فرانسیسی زبان صرف جہنم میں بولی جائے گی۔' (یہ ان کا اپنا فرمان ہے) کیونکہ جس تیزی سے شرح پیدائش گر رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس اپنی نسلوں سے مکمل ہاتھ دھو چکے ہوں گے۔

ہم آنکھیں بند کیے بگٹٹ اسی راستے پر دوڑ لگا رہے ہیں۔ یہ بھول کر کہ انسانی بچے کی پیدائش اور پرورش کسی چڑیا یا بکری کے بچے کی مانند نہیں ہے۔ حد درجے حساس اور احتیاط طلب ہے۔ انسانی بچہ بے پناہ توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ تہہ در تہہ محبتوں کے

حصار میں گھیر کر پالا جائے تو کسی لائق بنتا ہے۔ اس کی شخصیت میں بنیادی عنصر جو اسے خوداعتمادی اور بلند پروازی عطا کرتا ہے۔ وہ توجہ، محبت کی گرمی اور انتھک محنت ہے جو ہمارے ہاں رنگا رنگ محبتوں کے مشروب گھول گھول کر اتاری جاتی ہے۔ والدین کے ساتھ وسیع ترین خاندان۔ ددھیال، ننھیال کے رشتے مل جل کر اس کی شخصیت سازی میں اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ ایک ہاتھ منظر سے ہٹ جائے تو دوسرا اور پھر تیسرا اسے ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار رہتا تھا۔ پھر کہیں خاک کے پردے سے انسان نکلتے تھے۔ اب ہم اس کارخانے کے درپے ہیں۔

جس کا کام اسی کو ساجھے

ہم اس بنیادی فلسفے کو بھلا بیٹھے ہیں کہ انجینئر سے مرض کا علاج / آپریشن کروانا...... درزی سے فرنیچر بنوانا...... بڑھئی سے کپڑے سلوانا ......طبی ڈاکٹر سے سڑکیں پل تعمیر کروانا......اسی وزن پر مرد سے بچے پلوانا ہے۔ اسلام میں یہ حساس کام عورت کے سپرد کر کے اس کے بہت زیادہ لاڈ اٹھائے گئے ہیں۔ اجر و ثواب کی بے شمار بشارتیں دی گئی ہیں۔

'جو خاتون اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں بیٹھی رہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گی۔' اسی طرح ملگجے گالوں اور پھٹے ہاتھوں والی عورت (گھر بار کی دیکھ بھال کی مشقت کی بنا پر) کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں اپنی معیت کی بشارت دی۔

پھر تخلیق کے مشکل ترین مراحل سے گزرتی ہوئی عورت کو نہایت عمدہ شاباش دی: ''عورت' جب امید سے ہوتی ہے تو حمل کے پورے عرصے میں ویسا ہی اجر و ثواب پاتی ہے جیسا ایک روزہ دار، شب بیدار، اطاعت گزار اور اللہ کی راہ میں جہاد

کرنے والے کو ملتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت تکلیف کے بدلے جو اجر و ثواب رکھا ہے اس کے بارے میں مخلوق اندازہ نہیں لگا سکتی کہ وہ کیا ہے اور کتنا ہے۔ اور جب بچہ جنم لیتا ہے تو دودھ کے ہر گھونٹ کے بدلے ماں کو وہ اجر و ثواب ملتا ہے جو ایک جان کو زندگی بخشنے کا اجر ہو سکتا ہے اور جب وہ دودھ چھڑاتی ہے تو اللہ کا فرشتہ (احترام و محبت سے) اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے کہتا ہے...... خدا کی بندی......! اب اس دوسرے حمل کی تیاری شروع کر دے......!''

رباط

عورت کو رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائے حمل سے دودھ چھڑانے تک کے زمانے کو اس طرح قرار دیا جیسے سرحد پر پہرہ دینے والا مجاہد...... اور یہ وہ درجہ ہے جس پر آپؐ نے فرمایا: ''دو آنکھیں ہیں جنھیں جہنم کی آگ نہ چھوئے گی...... وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے رو دی اور سرحد پر پہرہ دینے والی آنکھ۔''

اسلام کی نظریاتی حدود کا پہرہ عورت کے سپرد ہے۔ یہ وہ خدمت ہے جس میں وہ مرد کے برابر معاوضہ اللہ کے ہاں پائے گی۔ عورت کی ان خدمات کی قرآن نے تحسین فرما کر اسے حقوق کی ادائیگی کی سفارش کی۔

''اس کی ماں نے اس کو مشقت اٹھا کر پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنم دیا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔'' **(الاحقاف)**

اسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن سلوک کے لیے ماں کو تین گنا مستحق ٹھہرایا بہ نسبت باپ کے۔ (مساوات کا جھگڑا لا حاصل ہے۔ کہیں عورت کا مرتبہ اونچا ہے کہیں مرد کا۔) ماں کے اس مقام کو اللہ تعالیٰ نے حج کا رکن قرار دے کر اس کی تکریم فرمائی۔ حضرت ہاجرہؑ کی مامتا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے دنیا بھر کے مرد و زن کو ان کے

نقش قدم پر دوڑایا۔ اور اسے عبادت کا جزو قرار دے دیا۔ ایسی قدردانی۔'الشکور' ذات ہی کرسکتی ہے......!

رضاعت

بچے کو دودھ پلانا صرف اس لیے نہیں ہے کہ وہ بہترین صحت بخش، توانائی کی ضامن، صاف ستھری فطری غذا ہے بلکہ رضاعت بچے کے قلب وروح، احساسات و جذبات اور اخلاق وکردار پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ بچے کی شخصیت کی تکمیل کے لیے یہ مہر و محبت اور نرم وگرم گود کا تحفظ بہت اہم ہے۔ بچے کی جذباتی نفسیاتی تسکین کا باعث ہے۔ وگرنہ وہ بنجر کٹی پھٹی زمین کا سا ہوکر رہ جائے گا۔

کہاں نچھاور ہوتی یہ مامتا اور کہاں تکیوں کے بیچ اڑسی ہوئی بے جان بوتل ننھے منے ہاتھوں میں حیوانی دودھ لیے......افسوس کہ جیتے جی گود سے محرومی بچے کو دے دی جائے......!

مغرب میں 'پالنے یا جھولے کی اموات' (Crib Deaths) ہوتی رہیں۔ ننھا تنہا بچہ الگ کمرے میں لاوارثوں کی طرح چھوڑ دینا مغربی تہذیب کا حصہ ہے۔ بچے کو یہ کہہ کر ساتھ بستر پر سلانا (شدید جہالت گردانا جاتا ہے) ناپسندیدہ ہے کہ وہ کہیں ماں کے نیچے دب کر نہ مر جائے......! (شاید مغرب کی ماں، دن بھر دفتری مشقتوں کی ماری ماری کے نتیجے میں یہ کر گزرے ورنہ مسلمان ماں کے ہاں تو اس کا امکان لاکھوں میں ایک بھی نہیں۔ مامتا کی شدت فکر......اسے اتنا بے غم ہونے ہی نہیں دیتی۔ بچے کی ننھی سی ہل جل ماں کو گہری نیند سے اٹھا کھڑا کرتی ہے)۔ لہٰذا ماں باپ کی (پس پردہ) صرف اس خودغرضی کے تحت کہ بچہ ان کی زندگی میں مخل نہ ہو، الگ کمرے میں پالنے میں سلا دیا جاتا رہا۔ شاید وہ معصوم جان تنہائی کی بھینٹ چڑھ جاتی رہی یا دودھ الٹ دینے اور

اس سے دم گھٹ کر اللہ کے پاس واپس لوٹ جانے ہی میں بہتری جانتی رہی۔ بہرصورت عدم تحفظ ہی کا یہ شاخسانہ ہے کہ بچہ انجانے میں موت کی بھینٹ چڑھ جائے۔

عورت کی فطرت اگر مسخ نہ کر دی جائے تو اس کے لیے دنیا میں جو تسکین، راحت، (Thrill) بچہ پالنے میں رکھی ہے وہ کسی بھی دوسری مصروفیت یا کامیابی کے حصول میں نہیں رکھی گئی۔ اسی بنا پر اسلام بچے کی پرورش کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ پورا نظامِ زندگی عورت کو اس کام کے لیے مکمل یکسوئی عطا کرنے کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا۔

بیرونی ذمہ داریوں سے رخصت

عورت کو فریضۂ پرورشِ اولاد کے پیش نظر باہر کے فرائض سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ وہی نماز باجماعت جو مرد کے لیے لازم ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر شدتِ غضب کا اظہار کیا ہے جو اذان سن کر مسجدوں میں حاضر نہیں ہوتے۔ اس کے باوصف خواتین کو اس سے آزاد کر دیا گیا۔ عورت کے لیے فرمایا:

- عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔ (مسند احمد)

- نماز جمعہ بھی عورت پر سے ساقط کر دی گئی۔ آپؐ نے فرمایا: ''جمعہ کی نماز باجماعت ہر مسلمان پر فرض ہے سوائے غلام، عورت، بچے اور بیمار کے۔'' (ابوداؤد)

- جنازہ اٹھانا اور کفن دفن میں حصہ لینا اجرِ عظیم کا باعث ہے۔ مومن کا حق بھی ہے لیکن عورت کو جنازوں کے ہمراہ جانے سے منع فرمایا۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب خواتین جنازے کے پیچھے جانے لگیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پلٹ کر ناراضی سے پوچھا: ''کیا تم اسے اٹھا رہی ہو؟ کیا دفن میں حصہ لوگی؟ جب تمھارا کوئی کام نہیں تو ساتھ آنے کی کیا ضرورت ہے؟ لوٹ جاؤ اپنے گھروں کو

سر وبال لے کر۔‘‘(فتح الباری)

عورت کا محاذ

جہاد، حق و باطل کا معرکہ جس سے شہادت کی سعادت نتھی ہے۔ رب کی رضا کا راستہ ہے۔ عورت کو یہاں سے بھی کلیتًا رخصت دے دی گئی۔ اس کا محاذ متعین کر دیا گیا: ’’تم اپنے گھر میں جمی رہو کیونکہ یہی تمھارا جہاد ہے۔‘‘(مسند احمد)

جہاد کی اصل رب کی رضا کو پانا اور اس سے اپنی وفاداری کی اعلیٰ ترین گواہی (شہادت) دینا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گھر کی ذمہ داری سے منسلک فرمایا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ عورت کا اصل محاذ یہی ہے کہ وہ گھر اور بچوں (مجاہدین ومجاہدات) کی پرورش کی مکمل ذمہ داری اس طرح ادا کرے کہ مرد گھر داری کی جملہ ذمہ داریوں سے بے غم اور بے فکر ہو کر عازم جہاد ہو سکے۔ مجاہد کو اس ضمن میں یکسو کر دینا ہی عورت کا جہاد قرار پایا۔ اپنے محاذ سے ہٹ جانے کا خمیازہ کیسے بھگتنا پڑتا ہے۔ غزوۂ احد اس کی ایک مثال ہے۔ درہ پر متعین تیر اندازوں کو یہ کہہ کر محاذ سونپا گیا تھا کہ ’اگر تم لوگ دیکھو کہ ہمیں پرندے اُچک رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں خود تمھیں بلا بھیجوں۔ اور اگر تم لوگ دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور انھیں کچل دیا ہے تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں بلا بھیجوں۔‘(بخاری) لیکن ان تاکیدی احکام کے باوجود جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان دشمن کا مالِ غنیمت لوٹ رہے ہیں تو ان میں سے بعض نے کہا: ’’غنیمت غنیمت ...... تمھارے ساتھی جیت گئے ہیں۔ اب کس چیز کا انتظار ہے، جس کے بعد چالیس تیر اندازوں نے مورچے چھوڑ دیے اور فقط عبداللہ بن جبیرؓ اپنے نو ساتھیوں کے ساتھ وہاں رہ گئے۔

یہاں اس ایک غلطی کی بنا پر مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ آج

عورت یہی غلطی کر رہی ہے کہ وہ محاذ ...... وہ درّہ جس سے دشمن کے پس پشت حملے کا اندیشہ تھا، جس سے مسلمان عورت کو ہٹنے سے منع فرمایا، جس محاذ پر جمے رہنے اور ڈٹے رہنے کا حکم ہوا...... مالِ غنیمت (فکر معاش: روپیہ پیسہ، گاڑی، بنگلہ) کی چاہت اس پر غالب آ رہی ہے اور وہ اس کی جانب لپک کر گھر اور بچوں کو بے یار و مددگار، دشمنوں کے حوالے کر رہی ہے۔ ٹیلی ویژن، مخرب الاخلاق کتب و رسائل، نیٹ، کیبل، ٹیلی فون ...... سبھی اس کی غیر موجودگی میں اس کے معصوم بچوں پر یلغار کر کے اس کا گھر اجاڑنے کا سامان کر رہے ہیں۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے مالِ غنیمت سمیٹنے اور نوکریوں، دفتروں میں فتوحات کے جھنڈے گاڑنے میں مصروف ہے۔ گھر، اولاد اور خاندان پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پہلی صدی ہجری کی عورت

اس دور میں عورت نہ بے شعور تھی اور نہ عقل و فہم سے عاری۔ جیسا آج کی تعلیم یافتہ عورت گمان کرتی ہے یا استدلال کرتی ہے کہ 'اکیسویں صدی کی چکا چوند میں سانس لینے والی عورت کو چودہ سو سال پہلے کی عورت پر قیاس کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو سادہ لوح خواتین تھیں جو گھر بچوں پر قناعت کیے بیٹھی تھیں / بیٹھ سکتی تھیں۔ المیہ یہ ہے کہ آج کی عورت پیچھے پلٹ کر اس دور کی عورت کو دیکھنے / پڑھنے کی بھی روادار نہیں ورنہ اسے پتا چلتا کہ وہ عورت فہم و ادراک، شخصیت کی مضبوطی، فراست میں آج کی عورت کے لیے شرما دینے کو کافی ہے۔ صحابیات کی پاک باز لیڈر شپ آج کی عورت کے لیے ارفع ترین نمونہ ہمراہ لیے ہوئے ہے۔ وہ ہر معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتیں۔ اپنے حقوق کی فکر انھیں بھی تھی، بلکہ اس ضمن میں کوئی سوال انھوں نے تشنہ نہ چھوڑا۔ آج کی عورت کے ذہن میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب وہاں موجود ہے۔

بنیادی فرق ایمان کے معیار اور آخرت پر یقین کا ہے۔

شانہ بشانہ

آج کے معاشرے میں مغرب سے درآمد شدہ تہذیب کے لوازم میں 'شانہ بشانہ' کی اصطلاح بھی ہے۔ ہماری تہذیب پر جو طعن و تشنیع کے تیر کسے جا رہے ہیں اسی میں یہ بھی شامل ہے کہ 'آپ آدھی آبادی کو بے کار اور عضو معطل بنا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔' 'ہر میدان میں 'شانہ بشانہ' مرد و عورت ترقی کی منازل طے کریں۔'' گاڑی کے دو پہیے' (حالانکہ دونوں پہیے اپنے اپنے مقام پر رہ کر چلیں گے تو منزلیں طے ہوں گی۔ دونوں پہیوں کو ذرا شانہ بشانہ ایک ہی جانب جوڑ دیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!) یہ اصطلاحیں سن کر ہم گھگھیا جاتے ہیں اور ہم حیرت زدہ، کسمسائے ہوئے، لجاتے ہوئے باپردہ بیبیوں کے نقاب نوچ کر، پردے چاک کر کے انھیں دفتروں، دکانوں پر لا سجاتے ہیں ......! خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

حضرت ام سلمہؓ نے قرآن میں عورت کا ذکر نہ ہونے کا اظہار فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں 'شانہ بشانہ' کی نہایت خوبصورت تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ (احزاب: ۳۵)

'اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں۔ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں۔ ان کے

لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔'

فرق یہ ہے کہ مغرب کی عورت دنیا کے لیے جیتی اور دنیا کے لیے ہی مرتی ہے اور مومن عورت اللہ کی مغفرت اور اجر عظیم ہی کی متمنی اور متلاشی ہے۔ اس کی سعی و جہد کا مرکز و محور اللہ ہی کی خوش نودی ہے: 'وَإِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ۔' اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف لیے دوڑ دھوپ کرتی ہے۔ اس کے برعکس جو شانہ بشانہ آج ہمیں تھمایا جا رہا ہے۔ درج بالا دس اوصاف کے مقابل وہ کچھ یوں ہے:

'K-2 پر چڑھنے والا مرد، K-2 پر چڑھنے والی عورت، پائلٹ مرد، پائلٹ عورت، باکسر مرد، باکسر عورت، پیراک مرد، پیراک عورت، ماڈل مرد، ماڈل گرل...... وزیر اعظم مرد، وزیر اعظم عورت وغیرہ وغیرہ یہ لا منتہا گردان ہے۔

یہ 'مردانگی' کا شوق

عورت، مرد کو آئیڈیل بنا کر اس جیسا بننے کی کوشش میں اپنی چال بھی بھول جاتی ہے۔ جین جو گرس کے کھڑی ہے، ہیٹ پہن کر تصویر کھنچوا رہی ہے۔ یہ عورت کی توہین ہے۔ احساسِ کمتری میں بے چاری مری ماری جا رہی ہے۔ یہ یک طرفہ ہاؤ ہو بہت ہو چکی۔ اب مرد غرارہ، لہنگا پہنے، دوپٹہ اوڑھے ......سرخی پاؤڈر لگائے ......لیکن اگر وہ ایسا کرے تو وہ مضحکہ خیز، مسخرہ بلکہ خواجہ سرا بن جاتا ہے۔ عزت گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ عورت کے خلاف سازش ہے کہ وہ اپنی نسوانیت کھو کر 'سمارٹ' کے لقب سے نوازی جائے۔ تصویروں، پوسٹروں میں 'نمونہ لائق تقلید' بنا کر پیش کی جائے۔ اللہ نے عورت کو اس مخمصے سے بچایا۔ اس کی نسوانیت کو لائق تکریم بنایا۔ پورا نظامِ اسلام عورت کی حفاظت پر مامور ہے اور اس سے اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ انسان سازی کا کام بہ

احسن سرانجام دے۔ حافظ بنائے تو جنت کا وہ تاج پائے جس کا یاقوت دنیا و مافیہا سے بہتر ہو۔ مجاہد بنائے تو جنت کی ضمانت بن جائے۔ بیٹی کی تربیت و پرورش کر کے جنت کا سرٹیفکیٹ پائے۔ اس کی شہادت، جہاد، رباط (سرحد کا پہرہ۔ جہنم کی آگ سے نجات) سب اسی کارخانے سے وابستہ ہیں۔ گھر کو جنت بنا دے۔ آخرت کی جنت پالے۔ فیصلہ اسے خود کرنا ہے۔ یہ بہتر ہے یا یہ کہ خود پائلٹ انجینئر بن کر، فوجی وردی، پولیس یونی فارم کی ٹوپی کس کے مردوں کی منڈی میں مرد کی ہوس ناکی کا نشانہ بنے۔ وہ مغربی 'شانہ بشانہ' کے بخار میں مبتلا رہے یا خالدؓ بن ولید، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، امام شافعی جیسے بیٹے دے کر دنیا سنوار دے۔

حقوق کا غم صحابیاتؓ کو بھی تھا۔ اپنی صلاحیتوں کا عملی اظہار وہ بھی چاہتی تھیں۔ معاشرے میں عضو معطل بن کر رہنا ان کے تصور سے بھی ماورا تھا۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ اپنے دین اور معاشرے کی خدمت کرنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے وہ سراپا سوال بن کر بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی رہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ جذبے نہایت پاکیزہ...... دنیا طلبی اور ہوا و حرص و ہوس سے پاک تھے۔ شانہ بشانہ وہ بھی تھیں ...... لیکن وہ شانے محرم شانے تھے۔ نامحرم مردوں کے شانوں سے چھوتے شانے اور غیر مردوں کے قدم سے ملتے قدم! ان کے ہاں اس کا تصور بھی ناممکنات میں سے تھا۔ اسلام مکہ سے نکل کر چار دانگِ عالم میں جہاں جہاں پھیلا، اس میں حضرت خدیجہؓ کی بے مثل پشت پناہی، حضرت سمیہؓ کے خون کی سرخی، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ کی صعوبتوں، کٹھنائیوں کا خونِ جگر، حضرت عائشہؓ نے مروی علم کی روشنی اور حضرت فاطمہؓ کی گود میں پلے پھولوں کی خوشبو ساتھ ساتھ تھی۔ عورت اگر اپنے محاذ پر جمی نہ رہتی تو اسلام کے بڑھتے پھیلتے لشکروں کے قدم فتح یابی سے یوں ہم کنار نہ ہوتے۔ افریقہ کے تپتے صحراؤں اور یورپ کے کلیساؤں میں یوں اذانیں نہ گونجتیں۔

عورت اور حکمرانی

یہ بھی اس بخارزدہ ذہنیت ہی کا شاخسانہ ہے کہ عورت مرد سے حکمرانی میں بھی مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے کہ عورت کو کمتر، حقیر مخلوق جان کر حق حکمرانی سے محروم رکھا گیا بلکہ حکمرانی، قیادت عورت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ یہ کرسی اور منصب حقیر ہے...... عورت کا وقار اس کے منافی ہے۔ اسلام عورت کے حق میں بڑا غیور ہے۔ وہ یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ عورت پورے معاشرے کے لیے مرکز نگاہ بنے۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر اس کا نام اور چرچا ہو۔ وہ تنقید کا نشانہ بنے۔ مناصب سے اقتدار کی کش مکش اور کھینچا تانی وابستہ ہے۔ عورت کا تقدس اور نزاکت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ وہ اس میدانِ کارزار میں گھسیٹی جائے اور دنیا اس کی ناموس کے در پے ہو۔

اسی غیرت کا اظہار اس حدیث میں ہے: ''جب تمھارے حاکم تمھارے اچھے لوگ ہوں اور تمھارے مال دار تم میں زیادہ سخی ہوں اور تمھارے معاملات مشورے سے طے پائیں تو زمین کی پیٹھ اس کے پیٹ سے تمھارے لیے بہت بہتر ہے اور جب تمھارے حاکم شریر لوگ ہوجائیں اور تمھارے مال دار بخیل ہوں اور تمھارے معاملات تمھاری عورتوں کے سپرد ہوجائیں تو زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے۔'' (ترمذی)

عملی مثالیں تاریخ میں ان حقائق کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ عورت اگر اس غیر کے کوچے (سیاسی و حکمرانی) میں قدم رکھتی ہے تو بے آبرو ہوکر نکلتی ہے۔ انگلیاں اس پر اٹھتی ہیں۔ اس کا نازک آبگینہ اس سنگ باری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تاریخ میں رضیہ سلطانہ کو نمونہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کہانی کے نشیب و فراز بھی یہ ظاہر

کرتے ہیں کہ فطرتِ نسوانی سے بغاوت کر کے اسے مردانہ وار تربیت دی گئی۔ وہ ان استثنائی مثالوں میں سے تھی کہ اسے امورِ سلطنت کے لیے زبردست تیاری کے مراحل سے گزارا گیا۔لیکن درباری امرا ایک خوبرو اور بے پردہ شہزادی کو دل سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یاقوت حبشی پر اس کی مہربانی ان کو سخت ناگوار گزرتی۔ رضیہ سلطانہ کے تخت آرا ہونے پر اس کے روبرو مؤدب اور دست بستہ کھڑا ہونا ان کی مردانہ انا کے لیے زبردست ٹھیس کا سامان لاتا اور وہ پیچ وتاب کھا کر رہ جاتے (فطرتِ انسانی سے جنگ کے یہی نتائج ہوں گے) لہٰذا اس کے خلاف منصوبہ بندی اور سازشوں کا بازار گرم ہوگیا باوجودیکہ اس نے انصاف اور جود وسخا کو اپنا شعار بنایا۔لیکن اسے امرا کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک التونیہ اس پری پیکر پر مرمٹا تھا۔حبشی غلام پر رضیہ سلطانہ کی مہربانی نے اسے رقابت کی آگ میں جلا کر خاک کر دیا۔اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ یاقوت حبشی کو تلوار کی نوک سے بھنبھوڑ ڈالا۔ رضیہ کی فوج کو شکست ہوئی۔ رضیہ سلطانہ کو اسیر بنا کر قلعہ بھٹنڈہ لے گیا۔ بالآخر دونوں کی باہم شادی ہوگئی۔ تین سال کی حکمرانی کے بعد بہرام شاہ کے ہاتھوں دونوں قتل ہوئے۔

عورت کی حکمرانی میں، اس کی نسوانیت کا حسن، اس کی طلب، چاہت کی کہانیاں ہی رقم ہوں گی۔ انھی قباحتوں، آلودگی سے بچانے کی خاطر اللہ نے اس ہیرے کو چھپا کر رکھا۔ دنیا کی بھوکی، حرص وہوس بھری نگاہوں سے بچا کر رکھا تاکہ اس کی آب وتاب گہنا نہ جائے۔ لہٰذا حکمرانی اس کے شایانِ شان ہی نہیں۔ اس کے مرتبے سے فروتر ہے۔اس میں ملک وملت کی بربادی ہے۔ جوان عورت کی حکمرانی میں پیدائش اولاد سے گزرنے کے مراحل بھی آئیں گے۔ اسلام حیا کے جس تصور کو پروان چڑھاتا ہے اس میں یہ کیفیت کیونکر گوارا ہوسکتی ہے کہ گویا پوری مملکت زچگی کے مراحل سے گزار دی جائے۔ عورت کی جسمانی نزاکت اور اس پر وارد ہونے والی کیفیات ہی

اس گراں بارِ ذمہ داری کے راستے کا کوہِ گراں ہیں۔ ہر ماہ اس کا تکلیف میں مبتلا ہو جانا قبل از ایام (PMS) کی نفسیاتی اتار چڑھاؤ کی کیفیت اور بچے کی پیدائش کے بعد کے نفسیاتی اتار چڑھاؤ (Baby Blues) پوری مملکت کے مقدر کو رولر کوسٹر کیفیت سے گزارنے کے مترادف ہے۔

کارہائے مملکت میں ایک ایسے منصب دار کی گنجائش نسبتاً نچلی سطح پر بھی نہیں بنتی، جس میں مستقل عذر ہائے طبی رکاوٹ بنتے رہیں کجا یہ کہ سلطنت کا اعلیٰ ترین منصب۔ ایک مومنہ، مسلمہ، صالحہ کی حیا یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی یہ کیفیات گھر کے اندر نشر ہوں کجا یہ کہ پورا ملک اس اتار چڑھاؤ کا تماشائی بنے۔ اسے اللہ نے بادشاہوں کی ماں بنایا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کی قدم بوسی میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس منصب کی طلب گار کیونکر ہو کہ یہ منصب خود جھک کر اس کے قدم چھوتا ہے......!

عورت کی امامت

یہ بھی انھی ایجادات کا حصہ ہے جس کا سہرا مغرب کے سر ہے جس نے اسرا نعمانی جیسی حیا باختہ، دریدہ دہن، اسلام دشمن عورت کو استعمال کیا جو سلمان رشدی ہی کی طرح صرف پاک ناموں کے پردے میں سارے ناپاک کام کرنے کے منصوبے بنائے بیٹھی ہیں۔ ان لوگوں کو صرف مسلمان گھروں میں پیدا ہو جانے کا اعزاز حاصل ہے۔ جہاں گھس بیٹھیے بن کر یہ کفر کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ ان کی ہر پکار پر ہمارے ہاں سے لبیک کہنے والا طبقہ بھی موجود ہے۔ یہ کہہ کر کہ...... تیری آواز واشنگٹن اور لندن ......! تاہم یہ کارہائے تجدید بھی انھی میں سے ایک ہے کہ جن کے لیے علامہؒ نے فرمایا تھا ۔

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اور یہ تو ایسی تقلیدِ فرنگی ہے کہ مساجد کو چرچ میں بدلنے کی سازش ہے۔ جین، ٹی شرٹ پہن کر ننگے سر مردوں کے 'شانہ بشانہ' نمازِ ابلیس پڑھنے کی سازش۔ اس کی ادائیگی کے لیے انھیں میسر بھی چرچ ہی آنا چاہیے تھا، سو آیا۔ یہ بات عقل وفہم سے بالاتر ہے کہ ایسی خواتین وحضرات اسلام علی الاعلان چھوڑ کر باضابطہ دامن کفر میں پناہ کیوں نہیں لیتے۔ دین کو بگاڑنے کا ٹھیکہ لے کر عبداللہ بن ابی کے قبیلے میں شامل ہونے کو بے تاب ہیں۔

اسلام حیا کے ضمن میں، دائرۂ کار کی علیحدگی کے بارے میں اتنا حساس ہے کہ وہ مسجد نبویؐ میں جہاں بعد از اسلام دنیا کے پاکیزہ ترین نفوس کا اکٹھ ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی مرد وزن کا اختلاط گوارا نہیں کرتا۔ حالانکہ امامت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تھی۔ وہاں کا نقشہ ذرا دیکھیے اور اسلامی مزاج کی غیرت اور حیا کا اندازہ لگا لیجیے۔ دراصل آج کا انسان حیا کے اس تصور ہی سے ناآشنا ہے جو اسلام کی گھٹی میں ڈالا گیا (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں حیا کا ایک متبادل لفظ موجود نہیں۔ چھ لفظوں کو جوڑیے جب بھی حیا قابل فہم نہیں ہوتی)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں مردوں کی بدترین صف ان کی آخری صف اور خواتین کی بدترین صف ان کی پہلی صف قرار دی ہے۔ وجہ؟ کہ یہاں مرد وزن کے مابین فاصلہ کم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ مسجد سے نکلے تو نماز سے نکل کر آنے والوں کو خلط ملط ہوتے دیکھا۔ آپ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس دن کے بعد صحابیاتؓ فرماتی ہیں کہ وہ راستوں میں یوں ہٹ ہٹ کر دیواروں سے قریب ہو کر آتی جاتی تھیں کہ دوپٹے دیواروں سے لگ کر پھٹنے کو آ جاتے۔ صرف اختلاط سے پرہیز اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی دیکھ کر...... اس بات کو آج کی عورت کیونکر سمجھ سکتی ہے کہ جس کی بے باکی اور دھونس دیکھ کر مرد پر حیا اور سہم طاری ہو جائے ...... ایسا ہی ایک منظر خواتین ارکانِ اسمبلی کے ایک بین الاقوامی اکٹھ میں دیکھنے میں آیا کہ مرد سہمے ایک

طرف کو کھڑے ہیں اور خواتین انھیں گزرنے کا موقع بھی فراہم نہیں کر رہیں۔

مسجدِ نبویؐ میں نماز سے فراغت کے بعد مرد بیٹھے رہتے اور خواتین الگ پچھلے دروازے سے نکل جاتیں۔ تب مرد اٹھتے تا کہ اختلاط کی نوبت نہ آئے۔ امامت میں دورانِ نماز غلطی ہو جائے تو اس پر ٹوکنے اور یاد دہانی کے لیے مرد سبحان اللہ پکار کر متوجہ کرے گا لیکن عورت ہاتھ پر ہاتھ مار کر یاد دہانی کروائے گی۔ مسجد میں سبحان اللہ کا نعرہ نہیں لگائے گی۔ عورت کی آواز کا حسن بھی چھپایا گیا۔ لیکن آج جب مرد و زن اسٹیج پر اکٹھے آواز کے جادو جگانے اور دوگانے، الاپنے پر آ جائیں تو وہ حیا کے اس معیار پر انگشت بدنداں ہی ہو سکتے ہیں۔ سمجھ نہیں سکتے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

ایسے میں عورت کی اذان، اس کا اقامت کہنا، اس کا امامت کروانا خارج از ایمان، خارج از اسلام حرکات نہیں تو اور کیا ہے۔ اس پر سوال اٹھانا بھی دیوانگی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ ''عورت امامت نہیں کروا سکتی'' بات یہ ہے کہ ''امامت کا منصب عورت کے وقار کے منافی ہے۔'' اس کے حسن قرات پر جذبات اتھل پتھل ہوں...... خدا کی پناہ...... مومنہ عورت یہ کبھی چاہ ہی نہیں سکتی کہ وہ ایسے ایڈونچر کا شوق پالے۔ ایسے شوق ذوق رکھنے والیاں چرچ چلی جائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں ابھی یہ قضیہ نہیں پہنچا۔ چرچ کی امامت ہر سطح پر مردوں ہی کے ہاتھ ہے۔ لیکن شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری، روشن خیالی، اعتدال پسندی کے شوق میں مخصوص مزاج کی حامل چند چھچھوری حرکتوں پر اتر آئی ہیں۔ اصلاً یہ نان ایشو ہے۔ اس لائق بھی نہیں کہ اس پر سوچا جائے۔ یہ نیکر پوش میراتھان قبیل ہی کی طرح کی چیز ہے۔ جسے بحمد اللہ معاشرہ کسی سطح پر بھی قبول کرنے کو تیار نہ ہوگا، سوائے غلامانِ فرنگی کی حقیری اقلیت کے۔

خواتین کی ترجمانی

خواتین مختلف مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے سوال، الجھنیں، حاجات پیش کرتی رہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر خواتین نے اپنے دل کی خلش بیان کرنے کے لیے اسماء بنت زیدؓ کو نمایندہ بنا کر بھیجا۔ اورانھوں نے رہتی دنیا تک کی مسلم خواتین کی نمایندگی کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی:

''میں قاصد ہوں مسلمان خواتین کی ایک جماعت کی طرف سے، جو میرے پیچھے ہے۔ سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں کہتی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میری رائے ہے کہ اللہ نے آپ کو مردوں اور عورتوں کی طرف بھیجا ہے۔ پس ہم سب آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی پیروی کی۔ لیکن ہم طبقۂ خواتین کا یہ حال ہے کہ وہ پابند، پردہ نشیں، گھر میں بیٹھی رہنے والی، مردوں کی خواہشات کی مرکز اور ان کی اولاد کو اٹھانے والی ہیں۔ اور مردوں کو جمعوں میں شرکت اور جنازوں اور جہاد میں حصہ لینے کی بنا پر فضیلت دی گئی ہے۔ جب وہ جہاد پہ جاتے ہیں تو ہم ان کے مال واسباب کی حفاظت اوران کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ تو کیا اے اللہ کے رسول! اجر وثواب میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوں گے؟''

حضورؐ نے صحابہؓ کی طرف اپنا رخ کیا اور دریافت فرمایا: ''کیا تم نے کسی عورت کو اپنے دین کے متعلق اس عورت سے زیادہ بہتر انداز میں سوال کرتا سنا ہے؟''

صحابہؓ نے جواب دیا: ''قسم خدا کی ہم نے نہیں سنا، (اور وہ بلا وجہ قسم نہیں کھاتے تھے!) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسماءؓ کو مخاطب کرتے ہوئے

کہا: ''اسماء جاؤ! اپنے پیچھے جو عورتیں ہیں ان کو بتادو کہ تمھارا اپنے شوہروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی رضا جوئی اور ان کے ساتھ موافقت کے لیے ان کی اتباع کرنا ان تمام خدمات کے برابر ہے جن کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے۔'' (الترغیب والترہیب)

بلندیٔ فکر

ان کا غم مال و دولت، گریڈ، منصب کا غم نہ تھا۔ شانہ بشانہ اقوامِ متحدہ کی کرسی تک پہنچنے اور جہازوں میں اڑان کا نہ تھا۔ ان کا غم اجر وثواب اور عنداللہ فضیلت کا غم تھا۔ ان کی فکر کی پرواز بہت اونچی ...... بہت بلند، مال و دولت دنیا سے ماوراتھی۔ لہٰذا پوری خود اعتمادی سے رسول اللہؐ کے سامنے خواتین کی نمایندگی کی۔ آپؐ نے بھی پوری حوصلہ افزائی اور ستایش سے نوازا۔ بہترین جواب قیامت تک کی مسلم عورت تک پہنچا دینے کو عطا فرمایا۔ اور کمال مہربانی یہ کہ ہم خواتین گھروں میں بیٹھ کر سکون و عافیت سے تمام تر اجر وثواب کی مستحق قرار پاگئیں جو مرد نے زورِ بازو سے کمایا۔ موسموں کی شدت، فاقہ کشی، میدانِ جہاد کی دھول، مٹی اور زخم کھا کر حاصل کیا۔ صرف اموال کی محافظت اور اولاد کی پرورش (جو یوں بھی ہمارے لیے وجہِ تسکین یعنی Self Rewarding ہے) کے عوض اللہ کی رضا جوئی اور جنت کی کمائی ہمارے حصے میں لکھ دی گئی!

عورت اور مرد کے مابین دنیاوی مقابلہ کرنے کے سارے دروازے بند کر کے صرف اللہ کی رضا اور فضل اور نجاتِ اخروی کے حصول میں مقابلے کا دروازہ کھول کر صلاے عام دے دی گئی۔ فاستبقوا الخیرات۔ ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی تمنا ہے تو نیکیوں کے میدان میں اترو:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔(آل عمران ۳:۱۳۳) دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، جو متقیوں/اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

ہمیں اس بات پر 'سَابِقُوْا' کہہ کر اکسایا گیا ہے۔ گویا سَارِعُوْآ، سَابِقُوْا، دوڑو......لپکو......ایک دوسرے سے آگے بڑھنے، مقابلہ کرنے کی کوشش کرو۔ اللہ کی مغفرت اور وسیع وعریض جنت کی جانب۔ جس مقابلے میں تم آج پڑے ہو وہ تو قبر کی مٹی پھانکنے تک تمھیں بے قرار رکھے گا......اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُo حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَo (التکاثر ۱۰۲:۱-۲) مقابلہ کرتے کرتے مٹ جاؤ گے ہاتھ کچھ نہ آئے گا......قبریں جا دیکھو گے کثرتوں کی تلاش میں:

جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔ ہاں اللہ سے اس کے فضل کی دعا مانگتے رہو یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔(النساء ۴:۳۲)

یعنی راضی بہ رضا رہو۔ جو اللہ نے بنایا ہے اس پر قانع اور مطمئن رہو۔ حسد، بے چینی، اضطراب کے دروازے بند کر دیے۔ جس چیز پر اختیار نہیں اس کا غم نہ کھاؤ۔ مسابقت فی الخیرات کی فکر کرو۔ جو کمائی کرو گے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ وہاں مرد تمھاری کمائی نہ اچک سکے گا۔ تم مردوں کی محنت پر ہاتھ صاف نہ کر سکو گی۔ ہاں اللہ کا فضل مانگتے رہو۔ اور یہ اللہ بہتر جانتا ہے علیم ہے کہ تمھارے حق میں فضل کیا ہے۔ گنجے کے حق میں ناخن فضل نہیں ہوتے۔ اللہ کی تقسیم عین حکمت، عدل وانصاف کے مطابق ہے۔

ترقی کے لوازم

اس تربیت کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو نمونۂ عمل سامنے

آتا ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان عورت اپنے دائرہ کار میں اپنے حصے کے کام اور مرد اپنے دائرہ کار میں اپنے حصے کے کام باہم رفاقت، مصابرت کی فضا میں کامل یکسوئی سے کرتے رہیں۔
نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے عروج کی منزلیں اس تیزی سے طے کیں کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

تاریخ عالم گواہ ہے کہ قوموں کا عروج گھر، خاندان، مرد و زن کے باہمی تعلق کی نہج اور نوعیت سے وابستہ ہے۔عورت...... مرکز مہر و وفا بن کر خاندان کی قوت کا باعث بنی...... اُس نے سب کو باہم مربوط و مضبوط رکھا۔معاشرے کی بھرپور ترقی اس کے اپنے محاذ پر ڈٹ جانے کی بدولت ممکن ہوئی۔اگر اس مرکز مہر و وفا پر مردانگی تھوپ دی جائے تو دنیا نسائیت...... اس کی نرمی، سکینت اور عافیت سے محروم ہو جائے گی۔محبت کے پھوٹتے بہتے زمزمے خشک ہو جائیں گے۔انسانیت خشک سالی کا شکار ہو کر سسکتی پھرے گی۔جو آج مغرب کا حال ہے۔

دوسری جانب مرد میں عورت سے محبت، ہمدردی، تحفظ دینے کا جذبہ ودیعت ہے۔حقوق کی جنگ اس جذبے کو سرد کر دیتی ہے۔مجروح کر کے نیم جان بنا دیتی ہے۔ باہم حریف بنا دیتی ہے۔جس سے باہمی کشاکش جنم لیتی ہے اور سکون رخصت ہو جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبال ایک مضمون میں رقم طراز ہیں: ''میں اس خیال سے لرزہ بر اندام ہو جاتا ہوں کہ عورتیں قوتِ لایموت کا خود بندوبست کریں۔اس طرزِ عمل سے نسائیت کا جوہر تباہ و برباد ہو جائے گا، نیز یہ کہ

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو رومن ایمپائر کے عروج وزوال میں یہی نکتہ کارفرما نظر آتا ہے۔ فطری حدود کا لحاظ اور خاندانی نظام کی حفاظت رہی تو عروج تھا۔عورت کو لہو ولعب، سیر وتفریح میں استعمال کیا گیا تو گھر برباد ہوئے، قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔

تعلیم وتربیت

عورت کی تعلیم وتربیت ماں ہونے کے ناتے اہم تر ہو جاتی ہے کہ جو کچھ وہ جانے گی وہی اولاد میں اتار پائے گی۔ لہٰذا اس باب میں مرد وعورت دونوں ہی کے لیے یہ ضروری قرار پایا: ''علم حاصل کرنا فرض ہے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے۔'' گویا ایسا نہیں ہے کہ عورت حصولِ علم سے سبکدوش ہے۔ تاہم حصولِ علم جس کا درجہ فرضیت کا ہے دنیاوی تعلیم اور ڈگریوں سے منتھی علم نہیں ہے۔ قرآن وسنت کا علم ہے۔ کم ازکم ناگزیر علم جس سے ہر مسلمان کا واقف ہونا لازم ہے۔ اس میں عقاید کا علم، توحید/شرک، رسالت، آخرت کا علم، حلال وحرام، اوامر ونواہی، عبادات، معاملات میں فرائض کا جاننا ہے۔

علم، عورت کی ضرورت

عورت اگر اس ناگزیر بنیادی علم سے تہی دامن ہوگی تو اولاد کی تربیت نہیں کر پائے گی۔ وہ ماں جو توحید سے لاعلم ہو شرک میں قدم رکھنے سے کیونکر بچ پائے گی۔ رسالت اور مقامِ رسالت سے نابلد ہو گئی تو زندگی کے لیے نمونہ عمل کہاں سے لائے گی۔ آخرت کا تصور واضح نہ ہو تو دنیا کی دلدل میں سر کی چوٹی تک پھنس کر رہ جائے گی۔ عبادات کے فرائض و واجبات سے لاعلم ہوئی تو نماز، روزہ، زکوٰۃ بھی درست نہ رکھ پائے گی۔ معاملات کی دنیا میں قدم رکھے گی تو فساد اور جہالت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ لہٰذا عورت کا علم صرف اس کی دنیا وآخرت کے لیے ضروری نہیں ہے۔ بلکہ

گھر کی فضاؤں میں ایمان کا نور پیدا کرنے کے لیے (کہ بچے آنکھ کھولتے ہی اسلام پا لیں) اس کا علم دین میں راسخ ہونا (بنیادی ناگزیر علم کی حد تک) لازم ہے۔

لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہم عورت کو علم کا انتہائی حریص پاتے ہیں۔ ہمیں آپؐ کی خدمت میں درخواست گزار خواتین کی ایک نمائندہ خاتون کی گفتگو ملتی ہے:

- آپؐ کی گفتگو اور وعظ و نصیحت سے مرد مستفید ہوتے ہیں (اور ہمیں اس کا موقع نہیں ملتا) لہٰذا آپؐ اپنے اوقات میں سے ہمارے لیے کوئی ایسا دن مقرر کیجیے جس میں ہم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپؐ ہمیں وہ باتیں بتائیں جن کی اللہ نے تعلیم دی ہے۔

- آپؐ نے فرمایا: ''اچھا تو فلاں دن فلاں جگہ تم جمع ہو جاؤ۔'' چنانچہ وہ جمع ہوئیں تو حضورؐ ان کے پاس گئے اور اللہ نے جو دین آپ کو سکھایا اس کی آپؐ نے ان کو تعلیم دی۔'' (بخاری)

علم کے باب میں صحابیاتؓ کی طلب کے بے شمار واقعات مروی ہیں۔ خواتین میں دین سیکھنے کی تڑپ اور لگن تھی اور ان کی تعلیم و تربیت کا مکمل اہتمام رکھا گیا۔ تا آنکہ نسل در نسل خواتین میں علم و فضل رکھنے والیاں معروف رہیں۔ یہ روایت خود امہات المومنین کی قائم کردہ تھی، بالخصوص حضرت عائشہؓ کا مقام علم و فضل کے باب میں بہت اونچا ہے۔ حضرت عائشہؓ احادیث کی روایت میں اکابر روایانِ حدیث میں سے ایک ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

- حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے بہت سی باتیں یاد رکھیں۔ آپؐ کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہیں۔ لوگوں نے ان سے بہت زیادہ اخذ واستفادہ کیا اور

بہت سے احکام وآداب ان سے نقل کیے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ شریعت کے ایک چوتھائی احکام ان سے منقول ہیں۔'' (فتح الباری)

صحابہ کرامؓ کے مابین کسی چیز میں اختلاف ہوتا اور امہات المومنین میں سے کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں حدیث بیان کرتیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیتے اور اپنے تمام اختلافات چھوڑ کر اس طرف رجوع کرتے۔'' (زادِ المعاد)

اس روایت کو ہمیں زندہ رکھنا ہے۔ خواتین میں دینی علم کی طلب، چاہت پیدا کرنی ہے تاکہ گھروں میں ایمان کی روشنی قائم رہے۔

دنیاوی علم

رائج الوقت نظامِ تعلیم ہماری خواتین تو دور کی بات رہی ...... ہمارے مردوں کو بھی قومی نظریات اور امنگوں سے ہم آہنگ کرنے سے قاصر ہے۔ بلا استثنا ہمارے سرکاری اسکول ہوں یا پرائیویٹ اسکول ...... اس نظام تعلیم کا مقصد ایک ایسی قوم کو وجود میں لانا ہے جو اس نام نہاد گلوبل ویلج (عالمی گاؤں) کے بہترین غلام اور منشی بن سکیں۔ اس نظام تعلیم میں اسلام کا شائبہ تک نہیں۔ جو تھوڑا بہت اسلامیات یا اردو کی کتب سے جھانک رہا تھا اسے بھی فارغ خطی دی جا رہی ہے۔ مغرب سے درآمد شدہ کتب خدا بیزار ...... خدا ناآشنا ...... بیس سال سائنس، طب کی کتب پڑھ جائیے۔ اللہ کا وجود کہیں دکھائی نہ دے گا۔ سائنس موجود ہے۔ سائنس کے خالق کا تذکرہ حرام ہے۔ کائناتی قوانین کو دریافت کرنے والوں کے سر سارے سہرے بندھے ہیں۔ قوانین بنانے اور چلانے والی ذات کا تذکرہ ...... 'رجعت پسندی'، 'غیر عملی'، 'غیر سائنسی'، رد یہ جانا جاتا ہے۔ اور ہم ہیں کہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی مانند سر جھکائے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ ...... گونگے، بہرے، اندھے چلے جا رہے ہیں۔ جو پہچان، شناخت اللہ نے ہماری

آنکھوں میں اتاری تھی، ہم نے اسے کھرچ ڈالا۔تاریخ اور اپنے مشاہیر سے ہمیں کاٹ دیا گیا۔اپنی شناخت اور پہچان سے عاری مردوزن کے ریوڑوں کے ریوڑ ہیں جو پیسہ کمانے کی مشین اور کفر کے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں۔ایسے میں تو پورا نظامِ تعلیم تبدیل کر کے اسے اپنی ملت کے مقاصد،عزائم اور عقاید واقدار سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

عورت کی تعلیم کے اہداف

عورت کی تعلیم زراعتی فارم، کارخانے اور دفاتر چلانے کی بجائے اس کے مخصوص دائرہ کار میں کام آنے والی ہو۔نظام تعلیم عورت کے اندر ایک ایسی قوم وجود میں لانے کی اہلیت پیدا کرے جو دنیا کے سامنے اس فطری نظامِ زندگی کا عملی مظاہرہ کر سکے جو خالق نے انسان کے لیے تشکیل دیا ہے۔ اس کے لیے ریگولرر رواں تعلیم میں بنیادی سائنسی مضامین، مروجہ ایف اے، ایف ایس سی، بی اے، بی ایس سی کے ساتھ اس کے دائرۂ کار کی مناسبت سے ہوم اکنامکس، بچوں کی نفسیات، نیوٹریشن (غذائیات)، دست کاری، خانہ داری کے عملی مضامین، فرسٹ ایڈ، اور بنیادی طبی ضروریات کا علم بتدریج ساتھ رکھا جائے تا کہ ایک عام بچی تعلیم کی تکمیل کے ساتھ جامع ہمہ پہلو شخصیت بن کر نکلے۔

آج کے تعلیمی معیار کو مدنظر رکھیں تو کیفیت یہ ہے کہ ایم اے پاس لڑکی بھی خاطر خواہ علم نہیں رکھتی۔کاغذی ڈگری تو ہے لیکن علم اور علمی رویہ اس کی شخصیت کا جزو نہیں بنتا بلکہ امتحان دے کر، ڈگری لے کر ٹھٹھر جاتا ہے۔شخصیت سازی عنقا ہے۔عام اسکولوں، کالجوں میں عملی علمیت کا فقدان ہے اور جدید 'او لیول'، 'اے لیول' اور 'آ ئی ٹی' نوعیت کے اداروں کے فارغ التحصیل لڑکے لڑکیاں اقبالؒ کے مرثیے پر حرف بہ حرف پورے اترتے ہیں۔

نوجواناں تشنہ رو، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید
چشم شاں اندر جہاں چیزے نہ دید

ہمارے نوجوان پیاسے ہیں مگر ان کے جام خالی ہیں۔ چہرے چمک دار، دماغ روشن ہیں مگر اندر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں۔ کم نگاہ، بے یقین اور مایوس کہ ان کی آنکھ دنیا میں کچھ دیکھنے سے قاصر ہے۔ نیز یہ بھی کہ:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی دھارے کا رخ موڑا جائے۔ تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لا کر اسے ایک طرف دنیاوی ترقی کے مقاصد اور نظریاتی نہج کے حصول سے ہم آہنگ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مرد و خواتین دونوں کے لیے ان کے دائرۂ کار کے مطابق تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ ہوم اکنامکس لڑکیوں کے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔ تاہم مروجہ ہوم اکنامکس اس ضمن میں ناکارہ ثابت ہو رہی ہے کہ وہ کالج صرف ایک محدود طبقے کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ وہاں داخلہ بھی ایک محدود طبقہ پا سکتا ہے۔ وہاں کے اخراجات کا متحمل بھی محدود طبقہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس سے تیار شدہ طالبات صرف رئیس گھرانوں کی اکنامکس چلانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اس میں اصلاح کر کے اسے متوسط اور نچلے طبقے کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ محدود وسائل میں باعزت صاف ستھری زندگی گزارنے کے لیے سلیقہ شعاری ضروری ہے۔ اس کا تمام تر دار عورت کی تربیت ہی پر

ہے کہ جو گھر بنا بھی سکتی ہے اور اجاڑ بھی سکتی ہے۔

آج بدنصیبی سے دیوانہ وار بلکہ مردانہ وار گھر، گھرداری سے منہ موڑے نوجوان لڑکیاں تعلیمی میدان اور جاب مارکیٹ میں جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔ اس میں باضابطہ فخر محسوس کیا جاتا ہے کہ وہ گھر کے کام کاج سے نابلد ہیں۔ یہ شاخسانہ اسی احساس کمتری کی ماری ہوئی سوچ کا ہے جو مردوں کی مسابقت میں مردوں سے زیادہ بدسلیقہ اور پھوہڑ بن کر دکھانے پر جا ٹھہرتا ہے!

بے ہدف تعلیم

تعلیمی میدان میں جو شعبے عورت کے بنیادی فرائض اور دائرۂ کار سے متصادم یا غیر متعلق ہیں، وہاں عورت کو جا گھسنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مثلاً انجینئرنگ، بزنس ایڈمنسٹریشن، بین الاقوامی تعلقات، انجام کار عورت یہاں ان مردوں سے مقابلہ کر رہی ہوتی ہے جو فطری طور پر ان شعبوں کے لیے موزوں تر اور اہل تر ہوتے ہیں۔ کہیں وہ احساسِ کمتری کا شکار ہوتی ہے، کہیں وہ ملازمت کے سلسلے میں خود جگہ لے کر مردوں کو بے روزگار کرتی ہے (ضروری نہیں کہ انتخاب کی بنیاد اہلیت ہو۔ جنس ناتواں کے لیے شرائط اہلیت اور ہوتی ہیں۔ یوں بھی اب عالمی ایجنڈے کے تحت ہر جا عورت مسلط کرنا لازم کر دیا گیا ہے)۔ یوں عورت اپنی فطری صلاحیتیں زنگ آلود کر کے مصنوعی صلاحیتیں پروان چڑھاتی ہے۔ معدودے چند ذہین خواتین کا ان شعبوں میں اچھی کارکردگی دکھالینا سند نہیں ہوسکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سی ایس ایس کے امتحانات سے لے کر ایئر فورس تک ہر میدان میں مردوں سے مقابلہ کرنے کے شوق میں عورت کہاں سے کہاں جا نکلی۔ مردانہ یونی فارم، ٹوپی پہن کر بھری مارکیٹوں میں پولیس ڈیوٹی ادا کر رہی ہے۔ ہوائی جہاز میں پائیلٹ بن کر مردوں سے آگے نکلنے کو ہے۔ ڈپٹی کمشنر بن کر جلوسوں کے مابین گھری مذاکرات کرنے پر مجبور ہے۔

غرض جا بجا عجیب وغریب مناظر دیکھنے کو آ رہے ہیں۔ جو نہ عورت کے وقار و تقدس کے شایانِ شان ہیں اور نہ ہی اس کی نرم و نازک لطیف جان اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ نتیجتاً وہ عورت جسے اللہ نے ماتا کا جمال اور زوجیت کی محبوبیت اور سکینت سے نوازا تھا، معاش کے میدان میں اتر کر جوڑ توڑ، بحث مباحثہ کرنے والی، ہنگاموں سے نبرد آزما ہونے والی عورت بن جاتی ہے۔ مادرانہ شفقت کی جگہ لیڈرانہ چرب زبانی گھر کا مودت، سکون و راحت ختم کر دیتی ہے۔

مغرب کی نقالی کرنی ہے تو پوری کیجیے۔ بچپن سے تیراکی، جاگنگ، جم میں مردانہ وار پٹھے مضبوط کرنا، باکسنگ، جوڈو کراٹے، اکھاڑے میں جا کر پہلوانی، سبھی کچھ مردانہ وار کیجیے۔ نزاکت کی گود میں پل کر...... چوہے، چھپکلی کو دیکھ کر چیخیں مارنے والی، محفوظ ماحول کی پروردہ کو یکا یک زمانے کے سرد و گرم میں یوں دھکیل دینا...... ظلم عظیم ہے...... نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے......!

عمومی تعلیم

عام عورت کے لیے اتنا کافی ہے کہ مروجہ تعلیم کے ساتھ وہ بنیادی سائنسی شعور رکھتی ہو۔ بزنس کے بنیادی اصول جانتی ہو تو فبہا...... گھر بیٹھ کر کوئی ایسا کام کرنا چاہے تو کر سکے۔ قوموں کے عروج و زوال، ایک دوسرے پر اثر اندازی اور آویزش سے واقف ہو۔ اس کے لیے اگر وہ دنیا میں آنکھیں کھلی رکھے، اخبار و رسائل کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرے تو اسے بین الاقوامی تعلقات میں ڈگری کی قطعاً ضرورت نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ زندگی مختصر اور محدود...... ذمہ داریاں لامنتہا، اس میں ہر لمحہ سوچ سمجھ کر استعمال کرنا ہے۔ لامحدود علوم میں سے صرف نافع علوم کا انتخاب کرنا ہے، جو عورت کے فطری وظائف کے اعتبار سے کارآمد اور اسے باشعور بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

موزوں تر شعبے

ذہین و فطین اور با صلاحیت لڑکیاں میڈیکل اور تعلیم کے میدان میں مہارت حاصل کر کے معاشرے کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یہ پیشے عورت کی طبیعت اور مزاج سے مطابقت بھی رکھتے ہیں اور ہماری معاشرتی ضرورت بھی ہے۔ عورت کی فطرت میں ایک استاد اور ایک ہمدرد و غم گسار ہستی ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دو شعبوں میں اس کی صلاحیتیں بروے کار لائی جانی چاہییں۔ اس کے اوقاتِ کار بھی عورت کی سہولت اور ضرورت کے مطابق ڈھل سکتے ہیں اور ڈھالے جانے چاہییں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عورت کی تعلیم کا مقصد بنیادی طور پر اسے ایک بہترین ماں بنانا ہے۔ امومت کی ذمہ داریوں سے فراغت پر وہ اپنے اوقات معاشرے کی عمومی فلاح کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ کسب معاش اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تاہم بوقتِ ضرورت وہ اس میدان میں تمام تر حدود و قیودِ اسلامی کو ملحوظ رکھتے ہوئے قدم رکھ سکتی ہے۔ ملازمت پیشہ عورت تمام تر عزت و احترام کی مستحق ہے۔ تاہم یہ رویہ کسی طور قابل قبول نہیں کہ بلا ضرورت تمام خواتین کو جاب مارکیٹ میں دھکیل دیا جائے۔ یا گھر داری کو ترجیح دینے والی خاتون کو بے مصرف حقیر جانا جائے۔ اسلامی حکومت اس امر کی ذمہ دار ہے کہ وہ ملازمت پیشہ خواتین کو تمام تر آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچائے جہاں وہ محفوظ ماحول میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کر سکیں۔ مثلاً:

- شادی شدہ خواتین کے لیے...... کہ وہ شوہر/ بیوی کو ایک ہی شہر میں متعین کرے۔
- غیر شادی شدہ لڑکی کو اسی شہر میں ملازمت دی جائے جہاں اس کے والدین، سرپرست موجود ہوں۔

- ناگزیر حالات کے لیے ان کی رہائش کے لیے ایسے ہوسٹل جہاں ان کی عزت و وقار کے تحفظ کا پورا انتظام موجود ہو۔
- گرلز کالجز میں مرد کلرکوں کی جگہ خواتین کو دی جائے۔
- ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹر، نرسوں کو مردانہ وارڈوں میں ڈیوٹی سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ خواتین کی تیمارداری خواتین اور مردوں کی مرد نرس کریں۔
- ٹرانسپورٹ کے لیے رش کے اوقات میں خواتین کے لیے خصوصی ٹرانسپورٹ چلائی جائے۔ (یاد رہے کہ جاپان میں کلیتًا زنانہ ٹرینیں چلائی جاتی ہیں تاکہ خواتین مردوں کی دست برد سے محفوظ رہیں!)
- شرائطِ ملازمت میں خواتین کے اس دور کی مناسبت سے قانون سازی ہو جب وہ چھوٹے بچوں کی پیدائش اور نگہداشت میں مصروف ہوں۔

درحقیقت عورت کی تعلیم کا یہ تصور کہ جو پیسہ اس پر حکومت خرچ کرتی ہے وہ ملازمت کر کے اسے لوٹائے ...... بھٹکے ہوئے مغربی تصورات کا شاخسانہ ہے۔ چونکہ انسان سازی اور کردار سازی ان کے ہاں غیر اہم اور حقیر جانی گئی ہے۔ جبکہ ہمارے تصورِ حیات میں، عورت یہ سرمایہ قوم کو بہترین انداز میں لوٹا دیتی ہے جب وہ معاشرے کو مضبوط، صحت مند، صاحب کردار انسانوں سے نوازتی ہے۔

اس کے برعکس مغرب میں اولاد کسی طرح ایک فالتو، بے مصرف حادثے کے طور پر وجود میں آ جانے والی ہستی بنتی چلی جا رہی ہے جسے پہلے تو اس دنیا میں آنے سے روکنے کے لیے ہزاروں جتن کیے جاتے ہیں اور اگر وہ دنیا میں آ ہی جائے تو اسے جیسے تیسے کر کے پال لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حال ہی میں ایک سابق امریکی صدر یہ

کہہ اٹھا کہ اگر موجودہ صورتِ حال برقرار رہی تو کچھ عرصے بعد ہماری قوم حرام کی اولادوں ہی پر مشتمل ہوگی۔

جو سکینت ایک عورت (بلکہ مرد اور معاشرے کو بھی) حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ ایک باصلاحیت ارفع شخصیت کا مالک بیٹا یا بیٹی پرورش دیتی ہے۔ اس کے پاسنگ بھی وہ Thrill نہیں ہو سکتی جو ایک عورت خلانوردی سے حاصل کر سکتی ہے۔ جو روح پرور طمانیت اس ماں کو حاصل ہے جس کا گھر صاف ستھرا، بچے آسودہ، مہذب، شوہر نیک صفت، چاہنے والا اور وفا شعار ہو۔ وہ سکون اس عورت کے حاشیہ خیال، خواب و تصورات میں بھی نہیں جھانک سکتا جو تتلی بنی پھرتی ہے۔ کہیں دفتروں میں خوار ہوتی ہے۔ کہیں سڑکوں پر بدنگاہی اور آوازے کسے جانے کا سامنا کرتی ہے۔ کہیں بسوں، ویگنوں، رکشوں میں دھکے کھاتی ہے جب گھر آتی ہے تو ترسے ہوئے بچے محبت اور توجہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔ تھکا ہارا شوہر اجڑا بکھرا گھر دیکھ کر سر پھوڑنے کو دوڑتا ہے اور یہ بی بی اپنی تھکن سے چور ہڈیاں سمیٹ کر بستر پر جا گرتی ہے تو اگلے دن دفتر اور گھر کی دوہری ذمہ داری کے تفکرات اس کی نیند غارت کر دینے کو کافی ہوتے ہیں۔

ہم جوان کے نظام کا چربہ اتارنے کی فکر میں ہیں، ہمیں ضرورت ہے اس بات کی کہ اندھا دھند مغرب کی نقالی پر، مرعوبیت، گھگھیاہٹ میں غرق نہ ہوں، اس نفسیاتی دباؤ سے خود کو آزاد کر کے اپنے گھروں کو سکون اور عافیت کے گہوارے رہنے دیں۔

بیوہ اور مطلقہ خواتین یا دیگر ضرورت مند خواتین درحقیقت اسلامی نظامِ زندگی میں خاندان کے مردوں کی ذمہ داری میں ہیں۔ مرد کو وسیع تر خاندان کی کفالت نبھانے ہی کی خاطر وراثت میں بھی دوہرا حصہ دیا گیا ہے۔ جس کے لیے وہ اپنے خاندان کی خواتین کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ بصورتِ دیگر حکومت خود اس امر کی ذمہ دار

ٹھہرائی گئی ہے کہ وہ خواتین اور بے سہارا افراد کو لاوارث نہ چھوڑ دے۔

اسلامی حکومت کی اس ذمہ داری کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا:

''اگر کوئی شخص بے سہارا اہل وعیال چھوڑے تو ان کی کفالت میرے ذمے ہے۔''

آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نقل کرتے کرتے اپنی چال بھی بھول چکے ہیں۔ الجھے، تشکیک زدہ ذہن کی مالک عورت وہ نسل سامنے لا رہی ہے جو نظریاتی اعتبار سے بے جہت، اخلاقی اعتبار سے کھوکھلی، بے سمت...... آہ وہ تیر نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف...... کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔ جس طرح ایک لاغر، نحیف ونزار، خون کی کمی کا شکار مدقوق ماں ایک تندرست وتوانا بچے کو جنم نہیں دے سکتی، اسی طرح بیمار ذہن، بیمار روح، منزل ناآشنا عورت......قوم کو شاہین صفت بچے عطا کرنے سے قاصر ہے۔

علامہ اقبالؒ نے شرق تا غرب علوم کھنگال لیے۔ مغربی تہذیب اوڑھ پہن، برت کر دیکھ لی اور مغربی تہذیب کے ہاتھوں انسانی اقدار کی بربادی کا نوحہ جابجا پڑھا۔

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

آج کی یونی ورسٹیوں اور چمکتے دمکتے اداروں سے نکلنے والی نوجوان نسل عین اس شعر کی مصداق ہے۔ دماغ جدید ترین علوم کے فیض سے بے باکی اور طراری لیے ہوئے...... لیکن دل ہدایت کے نور سے بے بہرہ، منزل ناآشنا، اپنی شناخت سے بے خبر...... اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے...... نگہ کی بے باکی ایسی کہ بڑے بڑوں کو شرما دے...... حیا ناآشنا......!

ترقی کیا ہے؟

مسلمانوں کے دورِ زوال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے ترقی، اس کے معانی، اس کے ذرائع کو سمجھا نہیں ہے۔ مغرب نے اسلام سے اس کی ترقی کے سارے راز جو قرآن و حدیث کی بے مثل رہنمائی میں مضمر تھے، حاصل کر لیے...... مسلمانوں نے علوم وفنون کو جو عروج دیا وہ سب ہماری تن آسانیوں اور عیش پرستیوں کے ہاتھوں ہم سے کھویا گیا۔

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

مغرب نے، جہاں سے ہم نے چھوڑا تھا، وہیں سے ترقی کے سفر کا آغاز کیا۔ ہم پورا سرمایۂ علم وفن کھو بیٹھے۔ مغرب نے تمام اصول وضوابط اسلام سے لے کر صرف اللہ، رسول کا نام ہمیں لوٹا دیا۔ جس پر ہم تفرقوں اور جھگڑوں کی بنیادیں رکھ کر باہم سر پھٹول میں مشغول ہو گئے۔ جب پلٹ کر نظام زندگی میں ترقی کو سمجھنا چاہا تو یہ جانا کہ شاید مغرب کی ترقی اور اس کی قوت کا راز عورت کی بے حجابی، مرد کے سوٹ، ٹائی اور فائیو سٹار کلچر میں پنہاں ہے۔ یہی وہ معرکتہ الآرا اشعار ہیں، جو اقبالؒ نے کہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے زرقصِ دخترانِ بے حجاب
نے زسحرِ ساحرانِ لالہ روست
نے زعریاں ساق و نے زقطع موست

مغرب کی قوت ...... نغمہ و موسیقی ، بے حجاب لڑکیوں کے رقص و سرود میں نہیں۔ نہ ہی یہ قوت خوبصورت حسین وجمیل چہروں، عریاں پنڈلیوں اور کٹے ہوئے بالوں میں ہے۔ (ہم نے آج روشن خیالی، ترقی کے نام پر درجِ بالا تمام 'اوصاف' کا حصول قومی ایجنڈے کی ترجیح اول بنالیا کہ شاید رقص وموسیقی، عریانی اور بے پردگی ہی سے 'ترقی' نام کی چڑیا حاصل ہو جاتی ہے)۔

محکمی اورا نہ از لا دینی است
نے فروغش از خطِ لا طینی است
قوتِ افرنگ از علم وفن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

انھیں جو حیثیت حاصل ہوئی ہے وہ لا دینی نظام یا لا طینی رسم الخط کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ مغرب کی قوت اور کامیابیوں کا اصل سبب ان کا علم وفن ہے۔ جس سے ان کی تمام تر ترقی کے چراغ روشن ہیں۔ (ہم نے ان کے علم و تحقیق، محنت، لگن، پیشہ ورانہ دیانت داری اور مہارت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے عیوب سارے سمیٹے۔ عیش پسندی، مادہ پرستی، بے باکی، بے حیائی کو ان کی ترقی کا راز سمجھا۔ ہماری یونی ورسٹیاں، علمی ادارے فیشن شو اور عشق و عاشقی کے مراکز بن گئے۔ بسنت، ویلن ٹائن ڈے منانے کے مقامات۔ جبکہ ان کے ہاں یونی ورسٹیاں، تحقیقی ادارے دیوانہ وار محنت، علم کی پیاس کا عملی مظہر ہیں۔ جہاں وہ محنت میں دن رات ایک کیے دیتے ہیں!)

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر عمامہ نیست
علم وفن را اے جوانِ شوخ وشنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

دانائی اور علم وحکمت کا تعلق لباس کی وضع قطع سے نہیں ہے۔ نہ ہی جبہ وعمامہ

علم کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ اے جوانِ رعنا (مسلم)۔ مغربی لباس سے نہیں مغز سے ترقی حاصل ہوتی ہے۔

اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکر چالا کے اگر داری بس است
طبع درا کے اگر داری بس است

ترقی کے طلب گار ہو تو عقل و فراست اور دور اندیشی کے سوا کچھ مطلوب نہیں۔ عمل، ذہانت، تیز نگاہی درکار ہے۔ مغربی وضع قطع میں ترقی کا راز پنہاں نہیں۔ ہیٹ ترقی کا باعث نہیں اور عمامہ ترقی میں رکاوٹ نہیں۔

جبکہ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے لباس، اپنی اعلیٰ اخلاقی تہذیب، اپنی روایات سے خائف ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی مظاہر وظواہر کی نقالی سے ہم ترقی کی منازل سر کر لیں گے۔ المیہ یہ ہے کہ فکر وطبع کی چالاکی اور درا کی لوگوں کو اسلام سے دور ہانک لے جانے کے کام آ رہی ہے۔ دانش وری کے نام پر نظریاتی بیخ کنی کی جا رہی ہے۔ جس تہذیب کا ہم دیوانہ وار پیچھا کر رہے ہیں وہ اب روبہ زوال ہے۔ اپنی گزری ہوئی نسلوں کی بلند حوصلگی اور محنت واستقلال کا ثمر کھاتے کھاتے مغرب آج زوال پذیر ہے۔

'نیویارک ٹائمز' میں شائع ہونے والی حالیہ رپورٹ میں باب ہربرٹ نے اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ: ''بین الاقوامی جانچ پڑتال کے ایک حالیہ پروگرام کے تحت سروے رپورٹ یہ اطلاع دے رہی ہے کہ حساب کے مضمون میں انگریزی پڑھنے کی صلاحیت میں پندرہ سالہ امریکی بچے ۲۹ ممالک میں ۲۴ویں نمبر پر آئے ہیں، بالخصوص جب حساب کے سوال حل کرنے کی صلاحیت جانچی گئی۔'' **(بحوالہ 'ڈیلی نیوز' ۳۰ اگست ۲۰۰۵ء)** بچوں کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار پر بے انتہا فکرمندی کا اظہار کیا گیا

کہ امریکہ کا مستقبل کیا ہوگا جبکہ لاکھوں امریکی بچے ہائی اسکول بھی ڈھنگ سے پاس نہیں کر پا رہے جبکہ ایک متوسط درجے کا معیارِ زندگی حاصل کرنے کے لیے چار سالہ کالج کی ڈگری کا ہونا ناگزیر ہے......! یہ وہ پھل ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ اس کے ذائقے کی تلخی محسوس کر رہا ہے۔ بے لگام آزادیٔ نسواں کی تحریک، خاندانی نظام کا ٹوٹ پھوٹ جانا اب برگ و بار لا رہا ہے۔ ان کا کھیت تو چڑیاں چگ گئیں اور اب پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ہم......؟ آج ہم ان کی موجودہ خصلتوں میں ان کی ترقی کا راز تلاش کر رہے ہیں۔ افسوس، صد افسوس! ؎

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بت خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

تقلید کی کورنگاہی

ہم خلافت الٰہی کے وارث، خیر امۃ، حق کے گواہ بنا کر بھیجے گئے تھے لیکن ہم نے اپنا سارا سرمایۂ ایمان اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ آنکھیں بند کر کے ہم مغرب کی ذہنی غلامی اور تقلید میں مبتلا ہو گئے۔ نگاہ سے مرعوبیت کا پردہ ہٹا کر، آیئے ذرا ان حقائق پر بھی ایک نظر ڈال لیں تو جو نظامِ فطرت سے انحراف کی بنا پر مغرب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن رہے ہیں...... لیکن ؎

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

اللہ نے نظامِ فطرت بنا کر وارننگ دی تھی: ''جس نے اللہ کی حد بندیوں سے تجاوز کیا، اس نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔'' (الطلاق ۶۵:۱)

آیئے ظلم کی اس داستان کی ایک جھلک دیکھیں۔ یہ نمونہ ہے اور بے شمار کہانیاں پس پردہ ہیں۔ فطری تقسیم کار میں انحراف سے سب سے زیادہ نقصان خود عورت کی ذات اور اس کی شخصیت کو پہنچتا ہے۔ پھر تاوان پورا معاشرہ دیتا ہے۔

سب سے پہلے تو عورت اپنی فطرت سے بغاوت کرتی ہے۔ اپنے اندر ایک کش مکش کا سامنا کرتی، اس سے لڑتی، جھگڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ماتا گوندھ دی ہے۔ مغربی تہذیب و تربیت ان احساساتِ لطیف کو کچل دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ مردانگی پیدا کرنے والے تمام تر ہتھکنڈے ...... لباس، کھیل، مشاغل (کوہ پیمائی، ہوابازی، خلانوردی سمیت) غرض یہ کہ پوری زندگی عورت کو صرف جنس کی حد تک عورت رہنے دیتی ہے وگرنہ مردانگی کے تمام تر اوصاف سے متصف کرنا ہی اصل ہدف ہے۔ کھیلوں میں خواتین کے پٹھے (مسلز) ان کی مردانگی کی چغلی کھا رہے ہوتے ہیں (عریاں لباس اور کلوز اپ سے جن کے دکھانے کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے)۔ ان تمام تر کوششوں کے باوجود اندر سے بچوں کے لیے ہمکتی ہوئی ماتا بلیوں، کتوں پر نچھاور کی جاتی ہے۔ ان دو جانوروں کو مغربی معاشرے میں جو اہمیت حاصل ہے وہ ناقابل یقین ہے۔ جو زبان بچوں کے لیے (لاڈ اور محبت بھری) مخصوص ہوتی ہے، اسے یہ کتوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ گود میں بچے بھرنے، گلے لگانے، چومنے، محبت کا اظہار ان معصوم جانوں پر نچھاور کرنے کے بجائے یہ سب کتوں کے حصے میں آتا ہے۔ جواباً کتا صاحب بھی لاڈ سے مالک / مالکن کا پورا منہ اپنی زبان (ناپاک) سے چاٹ کر ادھار چکاتا ہے۔ حال ہی میں فرانس میں ایک عورت کا منہ ان کے لاڈلے کتے نے فرطِ محبت میں چبا ڈالا۔ اور یوں دنیا کا پہلا چہرے کی پیوند کاری کا آپریشن کیا گیا، کتے کی بدولت مالکہ کو نئی ناک نئے ہونٹ لگوانے پڑے! فاعتبروا ...... ہمارے ہاں کسی ہمسائے کی گود میں بچے کو پچکارنا، اس کی تعریف کرنا ماں کا دل موہ لینے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ان کے ہاں یہ سب ہمسائے کے کتے کا حق ہوتا ہے۔

اگر آپ نے بے توجہی برتی یا خوف سے سمٹ گئے تو وہ اس پر شدید ناراضگی سے لے کر کم از کم برا ماننے میں خود کو حق بجانب سمجھیں گے۔ وہاں کتوں کی مصنوعات تیار کرنے کی انڈسٹری خوب ترقی کر رہی ہے۔ کیونکہ جس طرح ہمارے ہاں بچوں کے لاڈ، دلار کے لیے والدین ہر راحت فراہم کرنا چاہتے ہیں وہاں یہ جملہ حقوق بحق کتا ضبط ہیں۔ مزید یہ کہ قانون مالکان کو پابند کرتا ہے کہ کتے صاحب جہاں چاہیں گندگی نہیں پھیلا سکتے۔ ورنہ مالک / مالکن کو جرمانہ ہوگا۔ لہٰذا مرد و زن اولاد کے نیپی بدلنے یا ''چھی'' دھلانے کی بجائے کتے کے پیچھے لفافہ اور گند گیر ہمراہ لیے پھرتے ہیں۔ کتوں کے بسکٹ، قسم قسم کی خوراک، کھلونے، کتوں کے ڈاکٹر، ادویات...... ایک مامتا جھگڑے کیا کیا......! ہمارے ہاں جسے ''ڈنگر ڈاکٹر'' (معالجِ حیوانات) کہہ کر بے مصرف کر دیا جاتا ہے وہ وہاں دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورتے ہیں۔ یہ ممتا کی تسکین کے ناجائز طریقے ہیں۔

اس تگ و دو کے باوجود اگر یہ دیوانہ فیصلہ کر ہی لیا جائے کہ بچے ہوں تو وہ ایک الگ دردبھری داستان ہے اولاد پہلے وجود میں آ جاتی ہے۔ والدین نکاح کر لینے کا فیصلہ (اب) اکثر و بیشتر بعد میں کرتے ہیں۔ بھرپور تعلیمی زندگی اور بے انتہا مصروف ملازمتی زندگی (عورت کی) میں سے بچے پیدا کرنے اور تربیت دینے کے لیے وقت نکالنا کارے دارد ہے۔ بے انتہا مصروف لیکن اولاد کی خواہش مند خواتین کے لیے سائنس نے ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''کرائے کی ماں'' حاصل کر لی جائے۔ ابتدائی مراحل کے بعد بچہ ''کرائے کی ماں'' کے رحم (womb) میں ٹھکانہ کر لے۔ وجود میں آنے کے بعد طے شدہ رقم کی ادائیگی کے بعد رسید کے ساتھ بچہ گھر لے آیا جائے۔ اس کے بعد نگہداشت اور دیکھ بھال کے لیے بے شمار آیائیں، ڈے کیئر سنٹرز کرائے کی مامتا دینے کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے تیار ہیں۔ ماں کا دودھ، ڈبے کے دودھ سے زیادہ صحت بخش ہے۔ لہٰذا یہ بیچا اور خریدا بھی جاتا ہے۔ اس کے ''دودھ بینک''

موجود ہیں۔لیکن یوں کرائے کی اگائی ہوئی نسل اب جو برگ و بار لا رہی ہے وہ مغرب کی چولیں ہلا ڈالنے اور دنیا کو درندگی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے کافی ہے۔

مغرب میں آج پورا نظام مرد کی اس ہوس ناکانہ خواہش نے درہم برہم کر دیا کہ وہ عورت کو ہر وقت، ہر جگہ ہمراہ دیکھنا چاہتا ہے۔اسے باہر نکال لانے کے لیے صنعتی معاشرے نے ہر سہولت عورت کے لیے پیدا کی کہ وہ اپنی جسمانی ساخت، جسمانی مجبوریوں اور بچوں کی ذمہ داریوں کے ہر بوجھ سے بآسانی نبرد آزما ہو سکے۔ذرا غور کیجیے اس تمام ترمہم کے نتیجے میں تو عورت سوائے مرد کے ہاتھ کھلونا بننے کے اور کوئی مقام نہ پا سکی۔

لمبے بال عورت کا حسن گردانے جاتے تھے۔حسن کا پیمانہ بدل ڈالا گیا۔اس لیے کہ عورت لمبی زلفیں سنبھالے سنوارے یا باہر اندر کی زندگی کے دوہرے بوجھ اٹھائے۔لہٰذا زلفوں کا بوجھ ہلکا کر ڈالو۔زنانہ مجبوریوں کے لیے طرح طرح کی ادویات اور ساز و سامان جو اسے تکلیف سے بچانے اور ہر میدان، دفتر، کھیل، تیراکی وغیرہم کے لیے شانہ بشانہ رہنے میں مدد دیں۔سکرٹ پہننا سنبھالنا ذرا نزاکت طلب، توجہ طلب تھا۔لہٰذا تم بھی وہی جین (jean) پہن لو تاکہ باہر نکلنے میں دقت نہ ہو۔کپڑے دھونے کو واشنگ مشین، برتن دھونے کو ڈش واشر۔مزید آسانی کے لیے پیپر پلیٹ کپ فراہم کر دیے۔کھانے پکانے کے جھنجھٹ سے آزاد کرنے کے لیے فاسٹ فوڈ، تیار کھانے ڈبوں میں بند، مائیکرو ویو اون، ہر کام آسان، میکڈونلڈ، کے ایف سی، پیزے، تم کچھ بھی نہ کرو۔آؤ باہر نکلو۔بس ہر جگہ ہر کاؤنٹر ہر گلی بازار چوراہے میں نظر آتی رہو۔پیسے کماؤ اور فوراً خرچ کر دو۔

بچے پیدا کرنے کی مشقت کو آسان کرنے کی ہر ممکن کوشش۔پہلے ڈبے کا دودھ بے پناہ اشتہاری مہمات سے متعارف کروایا گیا۔ماں کو دودھ پلانے سے فارغ کر دیا گیا۔پھر سائنس بی بی نے ڈبے کے دودھ کے نقصانات بچے اور ماں (بریسٹ کینسر) دونوں کے لیے بتا دیے، تو ''دودھ بینک'' قائم کر دیے۔تاکہ ماں کا دودھ اسی

آسانی، سہولت سے خریدا جاسکے جیسے کھیتوں یا باڑوں میں چرتی چگتی گائے کا دودھ۔ تیار شدہ لنگوٹ (pamper) کی ایجاد نے ہر وقت کلوٹ دھونے کی مصیبت سے بچالیا۔ اب نیا تماشا یہ بھی ایجاد کرلیا کہ ''دودھ بینک'' کے بعد ''بیضہ بینک''...... حیرت انگیز...... یعنی عورت بھری جوانی بیس تا تیس پینتیس سال تو ڈٹ کر نوکری کرے اور کیریئر بنائے۔ اپنی ذات سے زیادہ منڈی کی معیشت مضبوط کرے۔ رہی بچوں کی چاہت اور طلب تو اسے موخر کرکے قابل الحصول بنانے کے لیے جواں عمری کے بیضے (eggs)، بینک میں فریز کروا کر رکھ لے۔ بعد ازاں جب چاہے...... ۳۵،۴۰ سال کی عمر میں تو یہ انڈے نکال کر زیر استعمال لائے جاسکتے ہیں۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے (کیونکہ یہ جدید ترین تحقیق ہے) کہ جمے ہوئے انڈوں سے کیسی نسل اگائی جائے گی۔ اس کے احساسات، جذبات برفانی دور کے کیا اثرات ہمراہ لیے ہوں گے۔ غرض یہ کہ عورت کے حوالے سے بھٹکنے، بہکانے میں مغربی تہذیب اتنی دور جانکلی ہے کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا۔

ناطقہ سر گریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

مسئلہ یہ ہے کہ انسانی بچہ، دیگر تمام مخلوقات سے بہت مختلف ہے۔ یہ بے پناہ توجہ چاہتا ہے۔ صرف کپڑے، صاف غذا، ادویات نہیں مانگتا۔ یہ وقت، محبت اور مسلسل نگہداشت مانگتا ہے۔ جو اسے نہ ملے تو یہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے اور یہی آج مغرب کا المیہ ہے۔ وہاں عورت کے اوقاتِ کار بھی انتہائی غیر نسوانی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بچہ سکول سے گھر آتا ہے (ہر بچے کی جیب میں گھر کی چابی ہے) تو خالی بھائیں بھائیں کرتا گھر اس کا استقبال کرتا ہے۔ دروازے پر لپک کر آنے والی ماں...... ''میں صدقے'' کہہ کر اس کا بستہ اتار کر ماتھا چوم کر گرم گرم کھانے کا اہتمام کرنے والے ہاتھ وہاں موجود نہیں (اب ہمارے ہاں بھی یہ ہاتھ بڑی تیزی سے کم ہوتے جارہے ہیں) فریج سے ٹھنڈا کھانا، برگر، سینڈوچ نکال کر ٹی وی / کمپیوٹر کے آگے کرسی گھسیٹ

کر بے دلی سے زہر مار کرلیا جاتا ہے۔ سارا دن اسکول میں کیا ہوا۔ ٹیچر نے کیا کہا۔ کامیابی اور ناکامی، بچوں کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے، الجھنیں...... گھر آتے ہی اپنے جذبات اور مشاہدات انڈ، الٹ دینے کی فطرت گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔

شام کو تھکی ہاری ماں گھر لوٹے گی۔ سویٹ ہارٹ کہہ کر چومے گی۔ لیکن دل و دماغ اتنی سکت نہ رکھتا ہو گا کہ بچے کی بے قراریوں کا فوری مداوا کر سکے۔ بچہ اپنی کہانیاں، آپ بیتیاں، اپنے بھالو، گڑیا، کتے سے کہہ سن کر خاموش ہو رہے گا (یاد رہے کہ ان کے ہاں فرضی دوست (make believe) اور خود کلامی بچپن ہی سے شروع ہو جاتی ہے!) ان کے بستروں پر دھرے چھوٹے بڑے بھالو (Teddy Bear)۔ مارے نقالی کے اب ہمارے گھروں، گاڑیوں میں بھی نظر آ رہے ہیں۔ اللہ اس دن سے محفوظ رکھے جب حقیقتاً ماں کی غم گساری دل دہی کی جگہ نرم گرم بھالو کو یہ فریضہ انجام دینا پڑے۔

گھر میں اس بچے کے لیے کوئی کشش نہیں۔ ایک مسلمان امریکن سکول ٹیچر کا کہنا تھا کہ چھٹی کے وقت کئی بچے اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے کہ وہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے۔ اس کی شفیق ہستی میں ممتا کی ترستی روحوں کو تسکین ملتی اور وہ گھر جاتے ہوئے روتے تھے۔ (ہمارے ہاں بچہ اسکول جاتے ہوئے روتا ہے! فی الحال......!)

ڈیٹرائٹ (امریکہ) کا اخبار ''فری پریس'' شاکی ہے: ''نکاحوں کی کمی، طلاقوں کی زیادتی اور نکاح کے بغیر مستقل یا عارضی ناجائز تعلقات کی کثرت یہ معنی رکھتی ہے کہ ہم حیوانیت کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ بچے پیدا کرنے کی فطرتی خواہش مٹ رہی ہے۔ پیدا شدہ بچوں سے غفلت برتی جا رہی ہے اور اس امر کا احساس رخصت ہو رہا ہے کہ خاندان اور گھر کی تعمیر، تہذیب اور آزاد حکومت کی بقا کے لیے ضروری ہے۔

راہِ فرار

درحقیقت ماں بننا اتنا بڑا چیلنج ہے کہ مغرب کی تن آسان ماں اس سے راہِ فرار

اختیار کر رہی ہے۔ حقوق اور مساوات کا واویلا ایک آڑ ہے۔ جس کے دامن میں وہ اپنی فطری ذمہ داریوں سے بچنے کی خاطر منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ دفتروں میں حسن پری بن کر گھوم لینا۔ ہر کس و ناکس سے داد وصول کرنا ایک نشہ بن جاتا ہے۔

ایک امریکن اسکول ٹیچر نے راقمہ کے سامنے اقرار کیا کہ جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اس نے سکول سے استعفیٰ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دو تین ماہ بعد ہی اس نے محسوس کیا کہ کلاس کے چالیس بچوں کو پڑھانا آسان ہے بہ نسبت اس ننھے سے نامعقول وجود کے، جو ہر لمحے توجہ اور محنت کا طالب ہے۔ لہٰذا وہ بچے کو آیا کے حوالے کر کے ملازمت پر لوٹ آئی۔

آج کی عورت کے پاس گویا صبر، تحمل، استقلال کا وہ سرمایہ ہی موجود نہیں ہے جسے وہ اس راہ میں کھپا سکے اور جو گوشت پوست سے لعل و گہر گھڑنے کے لیے درکار ہے۔ مائیکل ویریئر (Michel Verrier) کا "Le Monde" میں چھپنے والا مضمون (روزنامہ دی نیشن مکرر اشاعت ۱۳ نومبر ۵ میگزین) اس خبط سے پردہ اٹھاتا ہے کہ:

''یورپی ممالک میں جرمنی میں آبادی کا رُو بہ زوال ہونے کا مسئلہ سنگین تر ہے جو ملک کے مستقبل کے لیے ڈرامائی نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ جرمنی میں طویل عرصے تک عورت کا تصور اس روایت سے منتھی تھا کہ بچے، کچن اور چرچ۔ (بروزن، چادر، چار دیواری!) عورت انتھک بچے پالا کرتی تھی۔ بچوں کی بہبود کا پبلک نظام اسی لیے وہاں (دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں) پروان نہ چڑھ سکا۔ شادی شدہ جوڑوں میں یہ رویہ خوش دلی سے برقرار رہا کہ ''شوہر نوکری کرتا ہے اور بیوی گھرداری سنبھالتی ہے۔'' (فطرت کی پکار!)۔ تاہم بہت سی جرمن خواتین نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی آزادی اور کیریئر برقرار رکھنے کے لیے بچے پیدا نہیں کریں گی۔ کیونکہ فل ٹائم ماں تعلیم اور پیشہ ورانہ سرگرمیاں برقرار نہیں رکھ سکتی۔

شادی شدہ جوڑوں کا اب ایک تہائی (بعمر ۱۹ تا ۴۹ سال) چاہتے ہیں کہ وہ خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد رہیں۔ اس میں سے ۴۰ فی صد کے نزدیک کیریئر کا غم

اصل وجہ ہے۔ لہٰذا اب جرمنی میں رائج مزاج "Anti Kid" اولاد مخالف ہے۔

زیادہ تر جوڑوں کے نزدیک (بالخصوص خواتین) بچے پیدا کرنے کا مطلب ہے آزادی، لذت اور شاد باد زندگی سے دست برداری۔ بچے وقت اور پیسہ مانگتے ہیں۔ وہ نرا ہنگامہ شور شرابا ہوتے ہیں اور بے انتہا مشکل اور وقت طلب بھی۔ وہ آپ کو وہ سب نہیں کرنے دیتے جو آپ کرنا چاہتے ہیں اور آپ کی توجہ آپ کے کیریئر، زندگی کے لطف اور شہری طرز زندگی کے عیش و راحت سے ہٹا دیتے ہیں۔ (چھوٹے بچوں کو لے کر کسی فنکشن پر جانا ممکن نہیں رہتا!)

لہٰذا فطرت سے فرار اور تن آسانی عنوان ہے آج کی مغربی عورت کا جو ممتا کی پکار کو تن آسانیوں اور لذت طلبی کی چوکھٹ پر قربان کیے دے رہی ہے۔ ہم آنکھیں بند کر کے اگر یہ راستہ اختیار کریں گے تو درجہ بدرجہ یہ سب منزلیں لازماً طے کریں گے۔ پنڈی سے لاہور جو بھی سفر کرے گا خواہ عاصی ہو یا نیکوکار...... باپردہ کرے یا بے پردہ، سفر کی ایک سی منزلیں طے کرے گا۔ ہر ایک کی راہ میں سہالہ، گوجر خان، گجرات، گوجرانوالہ آئے گا۔ ہم مغرب کی راہوں پر بگٹٹ چل پڑے ہیں۔ ابتدائی منزلیں صاف دکھائی دے رہی ہیں۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے درست فیصلے کر لینے، راستے کا تعین لازم ہے کہ ہماری کتاب زندگی کا پہلا ورق ہی یہ دعا یہ صدا ہے...... اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۝

تاوان

مغرب ترقی کی ردا تلے جو تاوان ادا کر رہا ہے اسے ایک نظر دیکھا جانا چاہیے۔ عورت کے افزائش دولت کی مشین بن جانے کے نتیجے میں اعداد و شمار کی حد تک معاشی ترقی کا غلغلہ ضرور ہے لیکن دوسری جانب پورے ملک میں:

- گھروں سے بھاگ جانے والے بچوں کے لیے تحفظ فراہم کرنے والے اداروں کا اہتمام۔

- غیر تربیت یافتہ (ماؤں کی توجہ سے محروم) کم عمر بے نکاحی مائیں، جو سکول کے ایام ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی اور ایسے (حرام) بچوں کی دیکھ بھال کے مراکز کا انتظام۔
- ڈیپریشن/مایوسی کے مریضوں کا بڑھتا پھیلتا تناسب۔
- ذہنی، نفسیاتی امراض جن کے نتیجے میں ماہرین نفسیات کا کاروبار سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ گھر نہیں۔ بات سننے والا، دل کا درد/بوجھ بانٹنے والا کوئی نہیں لہٰذا بھاری بھرکم فیس چکا کر ماہر نفسیات کے آگے کتھارسس کروانے والوں کی روز افزوں تعداد۔

جیمز۔او۔وٹکر اپنی کتاب Introduction to Psychology میں لکھتا ہے:

''امریکہ میں دس بلین ڈالر سالانہ شراب پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ذہنی سکون پر لکھی گئی کتب سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ ہر ۷ میں سے ایک آدمی سکون آور (tranquilizer) ادویات استعمال کرتا ہے۔ باقی ۶ میں سے بھاری اکثریت شراب، ہیروئن، LSD استعمال کرتے ہیں۔ ایک سال میں ۳۰۰ ٹن مسکن ادویات (tranquilizer) استعمال ہوئیں۔ امریکی ہسپتالوں میں کل مریضوں میں سے نصف مریض دماغی/نفسیاتی امراض کے شکار داخل ہوتے ہیں۔''

خودکشی کے اعداد و شمار میں بے پناہ اضافہ۔ دنیاوی سہولتوں، مادی آسایشوں، معاشی ترقیوں کے باوجود روح کی تشنگی خودکشی پر مجبور کرتی ہے کہ محبت کرنے والا بے لوث سایہ جسے ماں کہتے ہیں غائب ہو چکا ہے (مشینوں، فیکٹریوں اور دفتروں نے ماں چھین لی)۔

انھی وجوہات کی بنا پر نوجوان نسل نشہ آور ادویات، جرائم کی نذر ہو جاتی ہے۔ جن کی بحالی کے مراکز اور جیلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کی فرصت نہ ہونے کی بنا پر (عورت/مرد

دونوں کمانے کی مشین بن چکے)، قومی وسائل کا بہت بڑا حاصل بوڑھوں کی نگہداشت کے مراکز پر اٹھ جاتا ہے۔ بڑھاپے کی کربناکی اور بے چارگی اس پر مستزاد ہے۔

خوش حالی یا بدحالی

یہ تو ہلکی سی ایک جھلک ہے کہ عورت کو گھر سے نکال کر، خاندانی نظام درہم برہم کر دینے کے نتیجے میں عورت، ترقی اور خوش حالی نہیں لاتی بلکہ بدحالی، افراتفری اور انتشار کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اگر عورت اپنا محاذ (گھر) سنبھال لیتی تو نئی نسلیں ان مراکز کا لقمہ نہ بنتیں۔ جتنا سرمایہ ان اجڑے، بکھرے لوگوں کی بحالی میں صرف ہو رہا ہے وہ تعمیری کاموں میں استعمال ہوتا اور ملک کی افرادی قوت، یکسوئی، سکینت اور مضبوط شخصیت کے ساتھ بہتر نتائج دے سکتی، جو ملک و قوم کی حقیقی ترقی کی ضامن ہوتی۔ مگر ہم مغرب کو دیکھ کر اپنی آنکھیں پھوڑ لینے پر تلے بیٹھے ہیں وہ مغرب کہ جس کا حال یہ ہے کہ۔

دیدہ ہا بے نور مثل نرگس اند......!

اسلام نے اسی لیے مضبوط معاشرتی نظام ہمیں عطا کیا۔ خاندان کے تحفظ کے گرد کڑے قوانین کی باڑ لگائی۔ پردہ، اختلاط کی ممانعت، حدِ قذف، حدزنا کا کرنٹ اس باڑ میں دوڑا دیا۔ خبردار وارننگ...... کا بورڈ آویزاں کیا۔ **تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا** (البقرۃ ۲:۱۸۷) ''یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ان کے قریب بھی نہ پھٹکو۔'' **تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا** (البقرۃ ۲:۲۲۹) ''یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں انھیں مت پھلانگو۔'' ان حدود کے اندر روشنی، سکون، اطمینان، عافیت ملتی ہے۔ مضبوط، توانا، پراعتماد، نسلوں کی ضمانت ہے۔ ان حدود کے اس پار ترقی کے سراب ہیں۔ شیطانی اکساہٹیں اور بلاوے ہیں۔ لیکن وہ سب صرف آخرت کی بربادی نہیں دنیا کی تباہی کا سامان بھی لا رہے ہیں۔

تن آسان مرد کی سازش

وہ نقصانات جو عورت کو پہنچتے ہیں، اس میں نہایت اہم بات یہ ہے کہ عورت اپنے دائرۂ کار سے باہر قدم رکھ کر مرد کے حصے کی بے شمار ذمہ داریاں بھی اپنے سر لیتی ہے۔ اسے کمر توڑ بوجھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت 'حقوق نسواں'، 'مساوات' اور 'آزادی' کے پس پردہ (شیطان کی سرکردگی میں) مغرب میں مرد کی سازش یہ ہے کہ: (۱) عورت اسے جنس ارزاں کے طور پر میسر آجائے۔ عورت اس کی کمزوری، اس کی طلب اور چاہت ہے۔ لہٰذا وہ اپنی سفلی خواہشات اور ہوس کے تحت دفتر، بازار، ہر جا اسے میسر پائے۔ (۲) مرد کی تن آسانی: مختلف نظام ہائے زندگی میں پس پردہ الٰہی رہنمائی (بذریعہ عیسائیت، یہودیت) میں بھی، مرد ہی تمام تر ذمہ داریوں سے لادا گیا تھا۔

اس دور میں عورت کو اکسانے والے وہ مرد ہیں جو اپنی تن آسانی کی خاطر، اپنی بے پناہ ذمہ داریوں سے جی چراتے ہوئے اپنے حصے کا آدھا بوجھ عورت کے نازک شانوں پر 'شانہ بشانہ' اور 'ترقی'، 'آزادی' کے خوبصورت نام سے لادے ہوئے ہیں۔ باہر کی آدھی سے زیادہ ذمہ داری عورت پر ڈال دی کہ وہ دفتر بھی جائے، نوکری کرے، بل ادا کرے، بچوں کو اسکول لائے لے جائے اور سودا سلف بھی ڈھوئے۔ اس کے ساتھ یہ کہ بچہ پیدا کرنے، پرورش دینے کی بنیادی ذمہ داری تو عورت ہی کی ہے وہ ساقط نہیں ہوسکتی۔ گھر سنبھالنا بھی اسی کو آتا ہے لہٰذا 'اس کا کام اسی کو ساجھے'۔ ایسے میں مرد صرف دودھ کی بوتل بنا کر بچے کو پلا دے یا کبھی نیپی بدل دے تو اسے تشکر آمیز حیرت سے دیکھا جاتا ہے کہ اتنا اچھا اطاعت گزار، تعاون کرنے والا شوہر (بلکہ

حاسدانہ غصے میں زن مرید کا طعنہ ہمراہ) ہے۔ اب امریکی ریاست کولمبیا کی ریاستی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا ہے کہ سینیٹر کالوس مورینی نے کہا ہے: 'اکثر شوہر، بیویوں سے غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ ان کی بیویاں اس وقت برتن دھونے میں لگتی ہوتی ہیں جب وہ خود بستر میں آرام فرمارہے ہوتے ہیں۔ ایسی بے انصافی ختم ہونی چاہیے۔ کھانا پکانے، صفائی، اور بچوں کو دیکھنا صرف خاتون کی ذمہ داری نہیں۔ اگر وہ ان کاموں میں بیوی کی مدد نہیں کریں گے تو بیویوں کو ان سے طلاق لینے کا حق ہوگا'......!

''ٹائم میگزین'' کی ایک اشاعت میں کرسٹائن ڈیوڈسن 'ڈیڑھ گنا کام' کے عنوان کے تحت اپنی آپ بیتی تحریر کرتی ہے۔ جس کے مطابق وہ پارٹ ٹائم ملازمت اور گھریلو ذمہ داریوں تلے پس چکی تھی، تا آنکہ اس نے ملازمت سے استعفاد ینے کا فیصلہ کر کے اپنی زندگی کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ سوال کرتی ہے کہ بھلا وہ عورت کس طرح صبح ۹ بجے بورڈ کی میٹنگ میں ہشاش بشاش، تازہ دم اور چاق و چوبند، پرسکون نظر آسکتی ہے جس کا بچہ صبح پانچ بجے تک اس کی گود میں الٹیاں کر کے بدحال ہوا جا رہا تھا!

مغرب میں اب طویل تھکا دینے والے سفر اور آزادی کے کڑوے پھل چکھنے کے بعد خواتین کی ایک معقول تعداد فطرت کی پکار پر لبیک کہتی ہوئی گھر اور بچوں کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔ ''ڈیلی میل'' اخبار ۲۴ مئی ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں ''سپر وومن'' کے عنوان سے پانچ خواتین کی ان کے بچوں کے ہمراہ تصویر چھاپتا ہے اور ان کی کہانیاں شائع کرتا ہے۔ پچاس ساٹھ سال پہلے ''سپر وومن'' (زبردست عورت) وہ خاتون تھی جو معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ اعلیٰ منصب پر فائز...... گھر بچوں، شوہر کی کھکھیڑ سے ماورا عورت تھی۔ لیکن یہ کہانی ان خواتین کو اس لقب سے نواز رہی ہے جو اعلیٰ ترین کیریئر اور تنخواہوں رمشاہروں کو لات مار کر گھر اور بچوں کی طرف واپس لوٹ آئی ہیں۔

اس مضمون میں میلیسا ہل (Melissa Hill) اپنی کتاب The Smart

Woman's Guide to Staying at Home میں کہتی ہیں: ''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ بہت سی خواتین اس بات کو جھوٹ جانتی ہیں کہ بیک وقت ماں بننا اور کیریئر (ملازمت) نبھانا ممکن ہے۔ نہ ہی کسی نے یہ بتایا تھا کہ ایک بچے کا بڑا ہونے کے مراحل سے گزرنا بذاتِ خود سخت مشکل مرحلہ ہے کجا یہ کہ ایسے میں ان والدین سے پالا پڑے جو تھکے ہارے ہوں۔'' تین بچوں کی ماں ۳۹ سالہ مارگریڈا فریئر اپنی نوکری چھوڑنے کے مسئلے پر نہایت قطعی رویے کی حامل تھی۔ مارگریڈا اپنی پہلی بچی کلارا (۸ سالہ) کی پیدائش سے پہلے شہر کی ایک بہترین فرم میں وکیل تھی۔ اسے رات گئے تک اور ویک اینڈ (چھٹی کے دن) پر بھی کام کرنے کی عادت تھی۔ مگر کلارا کے پیدا ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ وہ مامتا کے تقاضے اور ملازمت بیک وقت نبھا سکے۔ اس کا کہنا ہے: ''اگرچہ میرا کیریئر ذہنی/نفسیاتی اور معاشی اعتبار سے بہت نفع بخش تھا لیکن میرا دل تو میرے بچوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ان دونوں کو بیک وقت نبھانا ممکن نہ تھا۔ ایک سے بے انصافی ہونا لازمی تھا۔''

اس وقت بیس اور تیس سال کی درمیانی عمر کی حامل نوکری پیشہ خواتین میں ایک لہر سی چل پڑی ہے۔ ایسے ہی خیالات جو مولڈز (عمر ۲۹ سال) کے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''جب ہم سکول میں تھے تو اس وقت لڑکیوں کے لیے پیغام یہ تھا کہ لڑکیوں کو چاہیے کہ کیریئر کی راہ میں گھریلو زندگی/گھرداری کو رکاوٹ نہ بننے دیں۔ لیکن جوں جوں میں بڑی ہوئی، میں نے جان لیا کہ نہیں ...... میرا یہ خیال نہیں ہے ...... جب میں ایک میگزین کی اشاعت کی ملازمت کر رہی تھی، میں دیکھتی تھی کہ بچوں کی مائیں تھکی ماندی اور اپنے کام سے بے توجہی برتتی نظر آتی تھیں۔ میں انھیں بچوں کے سکول میں پہنچنے اور ان کے پروگرام اٹینڈ کرنے کے لیے بہانے تراشتی پاتی تھی۔ ہماری دیگر ساتھی ان پر خوب ناراض ہوتیں، برا بھلا کہتیں۔ میں ہرگز بچوں کے ساتھ اس طرح ملازمت نہیں کرنا چاہوں گی۔ بچوں کے ابتدائی سال بے انتہا اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک خوش و

خرم شادی شدہ زندگی اور محفوظ بچے کسی بھی ملازمت کی نسبت اہم تر ہیں۔

ولیبیا گرین جو تعلقاتِ عامہ کی آفیسر تھی، ساٹھ ہزار پاؤنڈ سالانہ کی تنخواہ اور شاندار طرزِ حیات ٹھکرا کر اس نے گھر بیٹھ کر ممتا کے تقاضے پورے کرنے کو ترجیح دی۔ ولیبیا اب ۳۴ سال کی ہے اور مغربی لندن میں چیسوک میں اپنے شوہر کے ساتھ رہائش پذیر ہے، جو ایک اشاعتی ادارہ چلاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ: ''اگر میں اپنی ملازمت جاری رکھتی تو یقیناً ہمارا گھر اس سے بڑا ہوتا اور ہمارے پاس کپڑوں اور سیر وتفریح کے لیے زیادہ دولت ہوتی۔ مگر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بچوں کے ابتدائی برسوں کی نگہداشت بے بدل ہے۔ اس کے سامنے بڑی سے بڑی دولت بھی حقیر ہے۔'' اگرچہ ولیبیا کو اپنی زبردست، اعلیٰ منصب کی حامل ملازمت بہت پسند تھی، لیکن اسے اکثر رات آٹھ بجے تک دفتر میں رہنا پڑتا۔ مزید برآں اس کے لیے ان پارٹیوں میں بھی شرکت لازم تھی، جو تعلقاتِ عامہ کی دنیا کے لوازم میں سے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ: ''شادی سے پہلے تو یہ یقیناً بہت دل خوش کن تھا، لیکن بچوں کی پیدائش کے بعد ان سے کھیلنا یا ان پر توجہ دینا زیادہ راحت کا سبب ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ دونوں کام بیک وقت ممکن نہیں تھے۔ میں بھلا اپنے موکلین، مالکان اور بچوں کی ذمہ داری یکساں طور پر کیونکر نبھا پاتی۔ عیش و عشرت میں کمی کا مطلب بہرحال یہ بھی ہے کہ میں اب گھر پر اپنی بچی کو ننھے ننھے پہلے قدم اٹھاتے دیکھ پاؤں گی، اپنے بیٹے کی معصوم حرکتوں سے لطف اندوز ہوسکوں گی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میرے بچے کتنے خوش اور مطمئن پل رہے ہیں۔ میرا اطمینان ہے کہ میں نے نوکری چھوڑنے کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔''

یہ صرف کج فہم عورت کا قصور ہے کہ وہ پرسکون زندگی کا تحفظ چھوڑ کر عیار مردوں کے ہاتھ کھلونا بنی ہوئی ہے۔ اللہ نے مرد کو مضبوط بنایا تھا، بلند درجہ دیا تھا، عورت نے اسے محبت بھری اطاعت اور خدمت گزاری پیش کی تھی، تاکہ وہ مرد کے مضبوط حصار میں پرسکون زندگی گزارے اور مرد عورت کے حق میں سراپا تحفظ رہے۔

تاکید یاد کیجیے ...... ''خبردار عورتیں شیشے (آبگینے) ہیں۔ ان کی حفاظت کرو۔'' (حدیث) آج ان آبگینوں کو کرچی کرچی کر دیا گیا۔ مغرب کی اندھی تقلید میں ہم سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ آیئے، ان کے نوحے دیکھیے، جو ان کے دانش ور ''شانہ بشانہ'' کے مرض کے نتیجے میں بیٹھے سر پیٹ پیٹ کر پڑھ رہے ہیں:

امریکہ کے ایک ماہر طبیب اطفال ڈاکٹر ٹی۔ بیری۔ برازلٹن (ہاورڈ یونی ورسٹی) بہ عمر ۸۰ سال ''لاس اینجلس ٹائمز'' میں رقم طراز ہیں: ''میرا اپنا احساس ہے کہ ہم نے خواتین کو بہت آگے تک دھکیل دیا ہے۔ انھیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور بدلے میں انھیں اپنے آپ کو سہارا دینے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ میرا ملک گردن تک پریشانی میں ڈوبا ہوا ہے۔''

ہیلری کلنٹن سابق خاتونِ اول، اپنی کتاب It Takes a Village میں کہتی ہیں:

بچوں کی صلاحیتیں روح تک کو کچل دینے والی غربت کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کے دل طلاق اور تحویل کی جنگوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا مستقبل ایک نہایت بوجھل نگہداشتی نظام کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر جس طرح ہم نے اپنے بچوں کو ناکام کر دیا ہے۔ اس سے ہمارا معاشرہ خود بھی اپنی ناکامی کی نذر ہو کر رہ گیا ہے...... ہر سال ۷۰۰۰ بچے قتل اور خودکشی کا شکار ہوتے ہیں۔ ہر چار میں سے ایک بچہ ان غیر شادی شدہ ماؤں کی کوکھ سے ہے جو ابھی خود بچپن کی حدود میں ہیں۔ روزانہ ایک لاکھ ۳۵ ہزار بچے پستول لے کر سکول آتے ہیں۔ ہر طبقے کے بچے بدسلوکی، بے توجہی اور جذباتی مسائل کا شکار ہیں۔ اگر آپ اپنے بچے کی پرورش و پرداخت میں نااہل ثابت ہوئے رہوئی ہیں تو پھر میں نہیں سمجھتی کہ باقی جو کچھ آپ کر رہے رکر رہی ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میری یہ ذاتی

خواہش ہے کہ ہر بچے کو ایک مستحکم اور قابل اعتماد خاندان ملے۔

ڈاکٹر برازلٹن خواتین کو تاکید کرتے ہیں: ''میرے خیال میں آپ جتنا وقت اپنے بچوں کے ساتھ گھر پر گزار سکتی ہیں گزاریئے۔ اس طرح گویا آپ اپنے بچے کو ایک تحفے سے نوازتی ہیں۔ لیکن نظامِ مغرب ایسا بن چکا ہے کہ صرف ایک ماں ہونا زیادہ سود مند نہیں۔ گھر میں رہنے والی مائیں نفسیاتی بحران کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

مادر پدر آزادی

آزادیِ نسواں کا المیہ یہ ہے کہ عورت گھریلو تحفظ سے بھی آزاد ہو گئی۔ شوہر کے سہارے (نان نفقہ کی ذمہ داری) سے آزاد ہو گئی۔ خواتین خود مختار، آزاد اور بے قابو ہیں۔ اس آزادی کے نتیجے میں بچے مادر پدر آزاد ہیں۔ بچے گھر کی سختیوں سے آزاد ہیں۔ وہ گھر ہی نہیں رہا جہاں والدین ان کی ضروریات پوری کرتے ہوں، قدم بہ قدم ان کی نگہداشت اور رہنمائی کرتے ہوں۔ والدین کام پر، اولاد بچوں کے کانجی ہاؤس (Farm House) میں ٹھونس دی گئی جسے ڈے کیئر (دن کی نگہداشت) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بچے خود مختار ہو گئے۔ چھوٹی چھوٹی عمروں سے بچوں کو جز وقتی ملازمتوں کا عادی بنایا جاتا ہے (قریبی سٹور میں مدد دینا، اخبار بیچنا)۔ ہمارے ہاں چائلڈ لیبر، بچوں کی مزدوری کا واویلا کھڑا کر کے ہماری صنعتوں میں کام کرنے والے غریب بچوں کا رزق ختم کرنے والے اپنے ہاں پلٹ کر دیکھیں وہ تو اپنے ہاں لڑکیاں تک کم عمری ہی میں گھروں سے نکال باہر کرتے ہیں کہ جاؤ اور اپنا رزق تلاش کرو۔ یہ بیس سال سے کم عمر بچے جو بچپن سے بلوغت کا سفر طے کرتے ہوئے بے شمار جذباتی، نفسیاتی تبدیلیوں سے گزر رہے ہوتے ہیں، ہر قدم پر توجہ، رہنمائی اور اعتماد دلانے کے لیے بڑوں کی محبت و نگرانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ انھیں یوں خودرو جھاڑیوں (Bushes) کی طرح اگنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہوگئیں

ایک اور بلا Child Abuse (بچوں سے بدسلوکی) کہلاتی ہے۔ مغرب میں اخبار، اشتہار، ٹرین اسٹیشن پر دیواریں جس رہنمائی سے بھری ہوتی ہیں وہ یہ بلا ہے۔ الجھے بکھرے والدین بسا اوقات حقیقتاً اولاد سے غیر انسانی، جلادانہ سلوک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جس میں بعض کیس تنہا باپ یا تنہا ماں (Single Parent) کے سر پر پلنے والے بچے ہوتے ہیں، بیوی سے لڑ جھگڑ کر شفقت پدری سے مجبور ہو کر باپ نے اولاد کے حقوق حاصل کر لیے اور وہ اسے تنہا پالنے کی ٹیڑھی کھیر کھانے کھلانے پر مجبور ہے (یاد رہے کہ وہاں مدد کے لیے اس کی ماں/بہن موجود ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں) نتیجہ یہ ہے کہ اس پہاڑ سے مشکل کام کو سر کرتے کرتے معصوم بچوں کی بے رحمانہ دھنائی کر ڈالتا ہے اور جنسی وحشت معصوم بچوں پر نکالتا ہے۔

اسی طرح تنہا ماں، نوکریوں کے دھکے کھاتی، بچوں کی پرورش کے گھمبیر مسائل کا سامنا کرتی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسی نفسیاتی کیفیت میں وہ بھی بچوں کی شامت لاسکتی ہے، سنگ دلانہ بے رحمی کی مرتکب ہوتی ہے (ایسے واقعات، اخبارات میں دیکھے جاسکتے ہیں جہاں وہ ننھے بچوں کو گھر میں بے یار و مددگار لاک کر کے، تالا ڈال کر چھوڑ گئی اور بچے گھریلو حادثوں کا شکار ہو گئے) لہٰذا والدین پولیس کے ہتھے، اور اولاد نگران والدین (Foster Parents) کی گود میں۔ یہی قانون ذرا بڑے بچوں کو وہ مادر پدر آزادی کی راہ دکھاتا ہے جو ہولناک ہے۔ ذرا باپ/ماں نے آنکھیں دکھائیں یا لاڈلوں کی مرضی کے خلاف کوئی ارادہ اور فیصلہ کرنا چاہا ادھر اولاد نے گویا (۱۵) ون فائیو کو فون کر کے پولیس بلالی۔ کہ ''میری ماں/باپ کو گرفتار کر کے لے جاؤ۔'' اسی طرح شوہر/بیوی کے مابین پولیس حائل ہے۔ معاشرتی زندگی کے قیمتی ترین رشتوں کے مابین، پولیس، عدالت، مقدمے آ براجمان ہوئے۔ گھر، گھر نہیں رہا۔ چوراہے پر زندگی گزارنے کے

مترادف ہو گیا۔ جہاں قریب ہی ماہر نفسیات میسر ہو گا جس سے ماں / باپ / بچے سبھی رجوع اور مشورے کر رہے ہوں گے۔ دادا / دادی / نانا / نانی کی جگہ ماہر نفسیات نے لے لی۔ ان بزرگوں کو اولڈ ہاؤس میں بلکتے، سسکتے بڑھاپا گزارنے کو چھوڑ دیا۔

موجودہ تہذیب جو اثرات مرتب کر رہی ہے وہ ہوش ربا ہیں۔ اقبالؒ کے قول کے عین مطابق...... چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر......

واقعات تو بے شمار ہیں۔ چند ایک دیکھ لیجیے:

جیمز، عمر ۱۴ سال۔ سکول میں نہایت ذہین اور محنتی لیکن شرارتی۔ تین بچوں کو خوب مارا پیٹا۔ شکایت ہوئی۔ کلاس ٹیچر نے ڈانٹ پلا دی۔ سکول سے چھٹی کے بعد پستول کی گولیوں سے استادِ محترم کو بھون ڈالا۔ جرم کی سزا ۲۸۱ سال قید۔ ۱۴ سالہ بچہ ہمیشہ کے لیے مجرم بن گیا۔ ۸۰ فی صد ننھے مجرم وہ ہیں جو باپ سے محروم ہیں۔ بچپن کی محرومیاں شخصیت پر مہلک اثرات مرتب کرتی ہیں۔ محبت کے پیاسے یہ بچے، چاہتیں غلط جگہ تلاش کرتے ہیں۔

جینیفر، بچی بہ عمر ۱۴ سال اپنے بوائے فرینڈ جان کے ساتھ تین سال سے دوستی نبھا رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس چھوٹی سی عمر میں وہ والدین اور معاشرے کی پشت پناہی اور رہنمائی سے محروم دو سالہ بچے کی بے نکاحی ماں ہے۔ یہ خود بن باپ کی بچی تھی۔ اس جیسی ۷۱ فی صد ماؤں کا تعلق ایسے ہی گھرانوں سے ہے جنھیں Single Parent Family کہا جاتا ہے یعنی تنہا ماں یا باپ کے سر پر پلنے والے بچے۔ ایسے گھروں کے بچوں میں جرائم کا تناسب دیکھیے:

- نوجوان خودکشی کرنے والوں میں ۶۳ فی صد درج بالا قسم کے گھروں کے پروردہ ہیں۔
- گھروں سے بھاگ جانے والے ۹۰ فی صد درج بالا قسم کے گھروں کے پروردہ ہیں۔
- زنا بالجبر کے مجرمین ۸۰ فی صد درجِ بالا قسم کے گھروں کے پروردہ ہیں۔

- نفسیاتی مریض ۸۵ فی صد درج بالاقسم کے گھروں کے پروردہ ہیں۔
- پڑھائی ترک کردینے والے ۷۱ فی صد درج بالاقسم کے گھروں کے پروردہ ہیں۔

اول تو شادی ہوتی نہیں۔ ہو جائے تو ۵۵ فی صد دو سال کے اندر طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔ طلاق کا طریق کار نہایت تکلیف دہ اور مہنگا ہے کہ جس کا شدید نقصان بچوں کو پہنچتا ہے۔ عورت کو تحفظ دینے کے خیال سے طلاق کے قوانین مرد کے خلاف ہیں اور خواتین کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا عورت مظلومیت کا بہانہ بنا کر سابق شوہر کو خوب ستاتی ہے۔ اس کی زندگی دو بھر کر کے اپنے انتقام کی آگ سرد کرتی ہے۔ بچوں کو باپ سے دور رکھ کر دونوں پر ناقابل تلافی ظلم کرتی ہے۔ ۳۷.۹ فی صد باپ بچوں سے ملنے/دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ شفقت اور نگہبانی کا مضبوط حصار ٹوٹ جانے سے معاشرہ تار تار ہو جاتا ہے۔ طلاق کے قوانین اور اس کے نتائج مردوں کو شادی کرنے سے روکتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک ٹینس کے کھلاڑی بورگ طلاق کے نتیجے میں دیوالیہ ہو کر اپنی عزیز از جان ٹرافیاں بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ ایسے میں شادی کرنے کی مصیبت کون مول لے گا! جب بے ٹکٹ کام چل جاتا ہے تو کون احمق ٹکٹ لے کر جیل جانا چاہے گا۔ لہٰذا معاشرتی مسائل الجھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔

میڈیا کی مدد

ماں بچوں کو وقت نہیں دے پاتی تو انھیں دل بہلانے، تنہائی کا غم غلط کرنے کو مشاغل خرید دیتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے دہانے سے جو کچھ اُمڈتا، ابلتا اور بچوں کے بگاڑ میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اب ٹیلی ویژن بچے کا پہلا مدرسہ ہے (ماں کی گود کی جگہ) مشرق و مغرب میں۔ اس مدرسے سے فراغت پر جب انگلیاں کمپیوٹر پر چلنا سیکھ لیتی ہیں تو ویڈیو گیمز کی دنیا میں بچہ قدم رکھ دیتا ہے۔ ان میں مقبول گیمز (شیطان ان ایکشن) نہایت پرتشدد مار دھاڑ پر مبنی ہیں۔ ''مارو...... جان سے مار دو بچ کر

نہ جائے ورنہ یہ تمھیں مار دے گا۔'' نعرے لگاتے بچے، بم پھٹتے ہیں، دشمنوں کے جسمانی اعضا پھٹتے نظر آتے ہیں۔ زوردار موسیقی، مار دھاڑ کے مناظر۔ سکرین پر پھیلتا خون۔ دو چار اکٹھے مرتے نظر آتے ہیں۔ ساتھ لکھا ہوا آتا ہے۔ ''آپ جیت گئے۔''

معصوم ذہنوں کے لیے انسانی جان کا تقدس ختم کرنے اور ان میں منفی رویہ پروان چڑھانے کے لیے اس سے بہتر تربیت اور کیا ہوگی؟ آج اسی بنا پر مغرب میں ایسے واقعات ہوتے دکھائی دے رہے ہیں جہاں اسکولوں میں لڑکوں نے اندھادھند گولیاں چلا کر چار چھ طالب علموں، اساتذہ کو مار ڈالا۔ گھر میں تھیوری پڑھی تھی۔ عملی مظاہرہ کرنے سکول چلے آئے۔ ردِعمل کا اظہار نہایت پُر تشدد، ذہنی سکون برباد، توجہات منتشر، بے چینی، غصہ، غیر معتدل جذباتی صحت، آنکھوں کی بیماریاں اس کا ثمر ہیں۔ بے سوچے سمجھے فوری ردِعمل ان گیمز کی تربیت ہے۔ کھٹا کھٹ چلتی انگلیاں تیز ردِعمل کو جنم دیتی ہیں۔ یہ گیمز بچوں کو بے حس، اکھڑ، بدتمیز، زبان دراز بنا رہی ہیں۔ توقف جو زندگی کا ایک نہایت اہم رویہ ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ فوری جواب، فوری ردِعمل سو خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ توقف، تحمل، برداشت، حلم...... زندگی کی اہم ترین خوبیاں فنا ہو جاتی ہیں، جس سے معاشرے میں انتشار، جھگڑے، الجھنیں، خلفشار پیدا ہوتا ہے۔

آج والدین بچوں کو راضی کرنے کے لیے اپیل، دلیل، بحث، مباحثوں کے بعد بھی ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں والدین کی نگاہ کا اٹھنا کافی ہوتا تھا۔ ماتھے کی تیوری ایک پیغام اپنے اندر رکھتی تھی۔ آج والدین کو خون کے گھونٹ پی کر، خاموش رہنا پڑتا ہے کہ عافیت اسی میں ہے۔

نتائج

انٹرنیٹ، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن اور انگلیوں کی دسترس میں گیمز نے صحت مندانہ کتاب بینی اور کھیل کے میدان کا رخ کرنے کے رجحانات ختم کر دیے ہیں۔ جسمانی

کھیل، صحت مند توانا جسم اور ذہن دونوں کے لیے ناگزیر ہیں، لیکن ان کی فرصت/رجحان ختم ہو رہا ہے۔ یہ تہی دامن نسلیں جو مغرب نے تیار کیں، ممتا کی گرمی اور شفقت پدری سے محروم، گھر کی مٹھاس سے محروم، اس فصل نے دنیا کو کیا دیا؟

مغرب کی ایک معروف ماہر نفسیات ایرک فرام (Erich Fromm) نے The Anatomy of Human Destructiveness میں مغرب کی درندگی کی تفصیلات دی ہیں۔ ۱۸۰۰ء۔ ۱۸۹۲ء تک ۶۵۱ جنگیں اور ۱۹۰۰ء۔ ۱۹۴۰ء تک ۸۹۲ جنگیں لڑی گئی ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد تو مغرب پوری دنیا فتح کرنے نکل کھڑا ہوا۔ نوآبادیاتی نظام کے ذریعے غارت گری اور استحصال کی نئی تاریخ رقم کی گئی۔

آج امریکی جارحیت صرف عراق میں لاکھوں جانوں کی ہلاکت کا سامان لائی ہے۔ قبل ازیں اسی تہذیب نے افغانستان، اس سے پیشتر عراق، کویت جنگ چھیڑ کر، اور ایران، عراق کو باہم الجھا کر جو بے حساب خون بہایا، وہ اس درندگی کا بیّن ثبوت ہے، جو درج بالا حقائق کے نتیجے میں تیار ہونے والی نسل کے ہاتھوں دنیا کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ یوں عورت کو گھر سے بے گھر کرنے میں پوری انسانیت خمیازہ بھگت رہی ہے۔ شاید یہ معاملہ بالواسطہ محسوس ہو لیکن حقیقت یہی ہے:

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجیو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

گذشتہ صفحات میں ہمارے سامنے ایمان اور فکری انتشار کی ایک کش مکش ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اگر واقعی ہمارے لیے اہم تر بات یہی ہے کہ "لوگ کیا کہیں گے" اور اگر طاغوت کی اطاعت کرتے ہوئے ایمان محض رسمی اعلان یا سماجی نمائش کا ذریعہ ہے تو پھر معاملہ دوسرا ہے۔ (اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مغرب کا طاغوت اس پوری تبدیلی کے باوجود کسی مسلمان کے لیے رو رعایت رکھنے کا روادار نہیں ہے)۔ اور اگر

ایمان کی دولت ہی عزیز تر ہے، تو پھر نظر روزِ آخرت پر ہونی چاہیے۔ اس زندگی اور اس دنیا کو آخرت میں کامیابی کا زینہ بنانا چاہیے۔

اسلام پیش کیجیے

ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کا مرکزی عنصر...... جو خاندانی نظام اور اس میں بہترین پہلو عورت کے پروقار اور مقدس ومحترم مقام پر مبنی ہے، وہ غیر مسلموں، بالخصوص اہل مغرب کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ، بہترین انداز میں پیش کیا جائے...... تاکہ مغرب کی محروم، بے سکون، دربدر عورت کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکے۔ اعداد وشمار گواہ ہیں کہ آج بھی مغرب میں عورت زیادہ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہی ہے۔ اسلام کا دامانِ عافیت اس کی پیاس بجھانے اور سہارا دینے کا سارا سامان لیے ہوئے ہے۔ نومسلم خواتین کی آپ بیتیاں اور انٹرویوز اس امر پر گواہ ہیں۔ ایسی ہی دو نومسلم امریکن خواتین براہِ راست مشاہدے میں آئیں۔ مسلمان مردوں سے شادی کرتے ہوئے ان کی خوشی اور راحت کا سب سے بڑا اظہار یہ تھا کہ: ''الحمدللہ اب ہمیں نوکری نہیں کرنی پڑے گی اور ہم سکون سے گھریلو زندگی کا لطف اٹھاسکیں گی۔'' مزید برآں غیر مسلم امریکی جوڑوں کے برعکس (جو سال بھر بھی شادی نبھالیں تو صد غنیمت) یہ بیبیاں گذشتہ پندرہ بیس سال سے پرسکون شادی شدہ زندگی گزار اور بچے پال رہی ہیں۔

ایک جانب مغرب میں پچھتاؤں کے یہ مظاہر نظر آرہے ہیں۔ دوسری جانب ہم بگٹٹ اُن فرسودہ راہوں پر دوڑے چلے جارہے ہیں جہاں سے مغربی تہذیب لوٹنے کی فکر میں ہے۔

ہمارے ہاں تحفظِ نسواں بل کے نام پر نومبر ۲۰۰۶ء میں حدود اللہ کی پامالی کا جو ساماں کیا گیا ہے اس کی بنا پر عورت پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہوگئی ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کے اسباب ومظاہر بڑھ گئے ہیں۔ سرِ عام فحاشی ناقابل دست اندازیٔ پولیس بنادی گئی۔

حالانکہ بے حیائی جتنی بڑھے گی عورت اُسی تناسب سے غیر محفوظ اور بے وقعت ہوتی چلی جائے گی۔ موبائیل، نیٹ کیفے، آزادی، تعلیم اور ملازمتوں کے یکساں مواقع کے نام پر جو کچھ سامنے آ رہا ہے وہ ناقابل یقین اور تباہ کن ہے۔ اگر اس کے آگے بند نہ باندھا گیا تو روشن خیالی کا سیلاب شرافت ونجابت کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

یوں بھی دجالی فتنے کا آغاز ہو چکا۔ احادیث میں مذکورہ علاماتِ قیامت پوری ہو چکیں۔ سٹیج تیار ہے..... پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ کی کسر رہ گئی ہے۔ **اللھم انا نعوذ بك من فتنه المسیح الدجال**۔ عورت کے حوالے سے درجِ ذیل حدیث بہت فکر انگیز پہلو سامنے لاتی ہے 'دجال مرقناہ' کی دلدلی زمین پر پڑاؤ ڈالے گا تو اس کی طرف نکلنے والی سب سے زیادہ عورتیں ہوں گی۔ حتیٰ کہ آدمی اپنی بیوی اپنی ماں، بیٹی، بہن اور اپنی پھوپھی وغیرہ کی طرف جائے گا اور اس ڈر سے انہیں رسیوں سے باندھ دے گا کہ وہ کہیں دجال سے نہ جا ملیں۔ (مسند احمد)

آج عورت کو جس راہ پر ڈالا جا رہا ہے۔ تنہا جوان بچیوں کا تعلیم کیلئے امریکہ، یورپ، چین بھیجا جانا۔ انہیں ہمہ نوع خطرات میں مبتلا کر دینا ہے۔ ترقی کی نیلم پری کے نام پر تعلیم روزگار میں مرد سے مسابقت نوجوان لڑکیوں کے اعصاب پر طاری کر دی گئی ہے جس کے لیے وہ اپنی نسوانیت بالائے طاق رکھ کر ہر حد توڑنے پر تلی بیٹھی ہیں۔ ہنگامی بنیادوں پر اِن رجحانات کو درست کرنے اور نوجوان نسل کی فوری تربیت کی ضرورت ہے۔

ہمیں اپنی بگڑتی، بپھرتی، بے قابو ہو کر مغرب کی اندھی تقلید پر مصر عورت کو بچانا ہے۔ دین دار طبقہ اس چیلنج سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ترجیح اول جان کر 'مسئلہ زن' کی طرف متوجہ ہو۔ اس زہر کا تریاق عام کرے۔ اور آزادی کے اس سراب کی حقیقت ہر سطح پر کما حقہ بیان کرنے اور تبیین کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔

❀❀❀

اکیسویں صدی اور مسلمان عورت

"اسلام کے دامان عافیت میں آج مغرب کی مجبور، بے کس، تشنہ لب استحصال شدہ عورت کے لئے اس کے تمام زخموں اور دکھوں کا مداوا موجود ہے۔ مغربی تہذیب بدنصیبی سے آج گلوبل تہذیب بن چکی ہے۔ اس نظام میں سب سے زیادہ نقصان آج عورت کو پہنچ رہا ہے جس کا تریاق ہم اہل اسلام کے پاس ہے۔ لیکن ہم اس سے خود بھی نابلد ہیں۔ ہمارے اپنے ہاں عورت جدید جاہلیت اور قدیم (ہنداونہ) جاہلیت کے مابین چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دین آشنا طبقہ پورے اعتماد و یقین اور قوت کے ساتھ اس پیغام کو عام کرے۔ آنے والی نسلوں کو اسلام کا شعور اور خود اعتمادی دے۔۔۔ اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار و روایات کو پورے فخر سے اپنائیے معذرت خواہی سے دامن چھڑائیے۔۔۔ مرعوبیت کا تریاق خود اعتمادی کے عملی اظہار میں ہے۔ شاید یہ کتاب اس تریاق کے کچھ قطرے فراہم کردے جو چومکھی جنگ لڑتی عورت کے تنے ہوئے اعصاب کو اسلام کی حیات بخش سکینت دے کر پرسکون کردے۔!"